عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

جون ۱۹۴۰ء

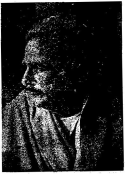

بیادگارِ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

(دورِ جدید)

مرتب	بدل اشتراک
(اخوندزادہ) حسین امام	پانچروپیہ سالانہ ششماہی ۳
جلد (۳) شمارہ ۶	ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق جون سنہ ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

لالۂ صحرا	ادارہ	۱
خوابِ غفلت	جناب اسد ملتانی	۲
لمعات	ادارہ	۳ - ۸
جہانِ نو (پاکستانی اسکیم قرآنی روشنی میں)	ادارہ	۹ - ۸۸

لالۂ صحرا

ایک سنسان دشتِ وحشت زا میں۔ ببول کے درخت کے قریب۔ چھوٹے سے ٹیلے پر ایک لالہ کے پھول نے اپنا سینہ شق کیا اور خونِ جگر کی پوری تابانی کے ساتھ گردوپیش کے ذرات کو شفق زار بنا دیا۔ وہ دن بھر یونہی سینہ چاک۔ گردن اٹھائے کسی کا انتظار میں کھڑا رہا۔ قریبِ شام اس کی نگہ امید کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ یاس وحرمان نے اس کی گردن کا منکا توڑ دیا۔ وہ شاخ سے الگ ہو کر گرا اور دامنِ صحرا نے اسے اپنے آغوش میں چھپا لیا۔

لالہ کا یہ پھول گمنامی میں پیدا ہوا۔ گمنامی میں پروان چڑھا۔ اور گمنامی ہی میں مرجھا کر مٹی میں جا ملا۔ نہ کسی آنکھ نے اس کے حسنِ رنگیں کی داد دی۔ نہ کسی لب پر اس کی جگر کاوی کا تذکرہ آیا۔

۱۹ مارچ کو قتل گاہِ لاہور میں ایک خاکسار کے سینہ میں گولی لگی۔ حالتِ نزع میں کچھ یوں بھی پیاس کا غلبہ ہوتا ہے۔ لیکن جب جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہوں تو شدتِ تشنگی کرب انگیز ہو جاتی ہے۔ آغشتۂ خاک و خون خاکسار سپاہی نے ایک پاس کھڑے ہوئے "انسان" کی طرف دیکھا اور پانی کے لئے اشارہ کیا۔ اس کے پاس ایک سنگترہ تھا۔ اس نے وہی خاکسار کو دیدیا کہ اسی سے پیاس بجھائے۔ اس نے سنگترہ لیا۔ منہ میں ڈالنے ہی کو تھا کہ جماعت کے اصول سامنے آگیا کہ خاکسار سپاہی قیمت ادا کئے بغیر کسی سے کچھ لیکر کھا نہیں سکتا۔ وہ ہاتھ منہ سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور دوسرا ہاتھ جیب میں چلا گیا کہ پہلے قیمت ادا کر دی جائے۔ ابھی وہ ہاتھ جیب ہی میں تھا کہ پیچھے سے "امن عامہ کے محافظ" ایک شقی القلب بدبخت سپاہی نے بندوق کا کندہ اس زور سے اس کے سر پر مارا کہ خاکسار کا دماغ پھٹ گیا۔ سنگترہ ہاتھ سے گر گیا جیب والا ہاتھ جیب میں رہ گیا۔ سنگترہ دینے والے کی طرف نگہ تشکر و امتنان سے دیکھا ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کلمہ پڑھا۔ اور یہ تشنہ لب شہید ساقیٔ کوثر کے قدموں میں جا گرا۔

اے ملتِ اسلامیہ کے گلستانِ خزاں منظر کے لالۂ صحرائی! تو گمنامی میں کہیں سے آیا۔ گمنامی میں جان دے دی۔ اور گمنامی ہی میں سپردِ خاک ہو گیا حتیٰ کہ آج تیری قبر تک کا صحیح نشان بھی نہیں مل سکتا۔ لیکن تیری اصول پروری اور اطاعت کوشی پر آسمان کے فرشتے گواہ ہیں۔ زمین کے ذرات شاہد ہیں۔ تیرا ایمان ظلمکدۂ پنجاب میں کوکب درخشندہ کی طرح جہاں تاب ہے۔ تیری قربانی نے یہ ثابت کر کے ہماری امیدوں کی دنیا میں پھر سے ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے کہ

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اے گمنام شہید! تیری قابلِ رشک موت پر لاکھوں زندگیاں نچھاور ہوں کہ اسی موت میں قوم کی حیات کا راز مضمر ہے۔ یہ سچ ہے کہ مرتے وقت تیرے حلق میں پانی ٹپکانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ لیکن آج تیری یاد میں کروڑوں آنکھیں نمناک ہیں۔

اے ایمانِ مومن کی زندہ یادگار!

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

خوابِ غفلت

[افسانہ نہیں حقیقت۔ طلوعِ اسلام]

چاہتا تھا ایک مسلم نوجواں ‏ ‏ شہر دلّی میں کرائے کا مکاں
ایک اچھا سا مکاں اُس کو ملا ‏ ‏ تھا جو ہر پہلو سے حسبِ مدّعا
تھی عمارت پکّی اور ستھری بنی ‏ ‏ خوب آتی تھی ہوا اور روشنی
نلکا پانی کا بھی تھا بجلی بھی تھی ‏ ‏ اور کرایہ بھی تھا بالکل واجبی
قصّہ کوتہ وہ مکانِ خوشنما ‏ ‏ ہر طرح اُس کے لئے موزوں تھا
گرچہ تھی اس کی ضرورت بھی اشد ‏ ‏ کر دیا لیکن مکاں وہ مسترد
جب سبب پوچھا تو بولا وہ جواں ‏ ‏ ساتھ کے گھر میں ہیں مرغے مرغیاں
مرغ پیہم بانگِ بے ہنگام سے ‏ ‏ صبحدم بیدار کر دیں گے مجھے

خوابِ راحت میں خلل آجائیگا
میری صحت میں خلل آجائیگا

سُن کے میں یہ بات حیراں رہ گیا ‏ ‏ دیر تک سر در گریباں رہ گیا
نوجواں اور اس قدر راحت طلب! ‏ ‏ العجب ثم العجب ثم العجب!
نازک اتنی ہو گئی طبعِ سلیم ‏ ‏ صبح جاگ اُٹھنا بھی ہے بارِ عظیم!
صبح خیزی تندرستی کا عمل ‏ ‏ یاں پڑے اس سے بھی صحت میں خلل!
بہرِ مسلم نیند سے اچھّی نماز[1] ‏ ‏ یاں سحر خیزی سے بہتر خوابِ ناز!
جس پہ بانگِ مرغ بھی گزرے گراں ‏ ‏ سُن سکے گا کیا وہ آوازِ اذاں
ہے یہ مغرب کے تمدّن کا اثر ‏ ‏ شب کو جاگے سو گئے وقتِ سحر
اے اسدؔ جس قوم کے ہوں نوجواں ‏ ‏ اس قدر دلدادۂ خوابِ گراں

ایسی غافل قوم کب ہشیار ہو
بخت اُس کا کس طرح بیدار ہو

اسدؔ ملتانی

---

[1] الصلوٰۃ خیر من النوم۔

لمعات

یوں تو خون کے چھینٹے اور آتشِ فتنہ کی چنگاریاں فرشتوں کی نگاہوں نے خیر آدم ہی میں بھانپ لی تھیں۔ لیکن محشرستانِ یورپ میں خوں ریزی اور فساد انگیزی کا جو منظر آج شعلہ بار ہے۔ چشمِ فلک نے اس کی نظیر اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس حقیقتِ ہوش ربا کے سامنے چنگیز و ہلاکو کی خونیں داستانیں افسانہ بن کر رہ گئی ہیں۔ ایک ایک معرکہ میں ایک ایک لاکھ انسانوں کی ہلاکت! بستیوں کی بستیاں نذرِ آتش! آبادیوں کی آبادیاں غرقِ جہنم! نہ زمین پر امن۔ نہ پانی میں اماں۔ نہ ہوا میں پناہ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اپنے عفریتی لشکروں کے ہجوم کے ہجوم، پہاڑوں کے غاروں اور سمندروں کی تہوں سے آزاد کر کے بے لگام چھوڑ دیئے ہیں کہ وہ انسانوں کی بستیوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح جھپٹ پڑیں اور بوڑھے۔ بچے۔ عورت۔ بیمار۔ کمزور۔ ضعیف کسی کی تمیز روا نہ رکھتے ہوئے جو سامنے آئے اُسے آگ میں بھون کر چباتے چلے جائیں۔ یہ تو ان کا حال ہے جو اس حلقۂ آتش و خون کے اندر ہیں۔ لیکن جو باہر ہیں وہ بھی سکون کی نیند نہیں سو سکتے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سہما ہوا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ساری دنیا پر ایک وحشت طاری ہے۔ سراسیمگی چھائی ہوئی ہے۔ پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ "انسانیت" ایک گوشے میں کھڑی کانپ رہی ہے۔ "نیکی" دوسرے کونے میں دبکی، سر نہوڑائے رو رہی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ساری دنیا اُبالی جا رہی ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب یہ اُبال بیٹھے گا تو دنیا کیا سے کیا ہو چکی ہوگی۔ لڑائی اور ایسی بے پناہ لڑائی! جنگ اور ایسی ہلاکت انگیز جنگ! ظهر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس

ایسی وحشت و سراسیگی میں کس دماغ کو فرصت مل سکتی ہے کہ وہ کچھ سوچے۔ غور کرے! لیکن اگر آپ کو کوئی لمحہ فرصت کا مل سکے تو ذرا سوچئے تو سہی کہ یہ کیا ہو رہا ہے! اور کیوں ہو رہا ہے؟ ہلاکو اور چنگیز خاں جاہل اور وحشی تھے علم و تہذیب کی روشنی سے محروم تھے۔ اس لئے قتل و خونریزی پر اتر آئے۔ لیکن یورپ تو آج علم و فضل کے معراجِ کمال پر پہونچا ہوا ہے۔ وہ تو تہذیب و تمدن کا صاحبِ اجارہ دار ہے۔ پھر اسے کیا ہو گیا کہ اس نے انسانیت کو چھاڑ کر یوں الگ کر کے

رکھدیا اور ایسی بے پناہ درندگی اور بربریت پر اتر آیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے علم وہنر کا فائدہ ہی یہ اٹھایا کہ یہ کس طرح عالمگیر ہلاکت کا موجب بن سکتا ہے۔ آج دنیا کے بڑے بڑے سائنسداں دن رات اسی فکر میں غرق بیٹھے ہیں کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کریں جس سے کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسان تباہ ہو سکیں۔ اللہ اکبر! کیا انسان کو علم وہنر کی نعمت اسی لئے نوازا گیا تھا کہ وہ اس سے درندوں کے تیز ناخنوں کا کام لے! پھر سوچئے تو سہی کہ اسقدر عقل وشعور رکھتے ہوئے۔ ساری دنیا کو دانش وبینش کا سبق دیتے ہوئے۔ یورپ کے سر پر یہ جنون کیوں سوار ہو گیا؟ آپ جسقدر بھی چاہے اس پر غور فرمالیجئے آپ ایک ہی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ یورپ نے تنہا عقل کو انسانی رہبری کیلئے کافی سمجھا اور آسمانی روشنی کو بیکار خیال کرکے اسکی طرف توجہ ہی نہ دی۔ عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا۔

جب ہم "آسمانی روشنی" اور "خدا کی حکومت" کہتے ہیں تو اسے آپ پادریوں کا وعظ نہ سمجھئے کہ جس سے مفہوم ایک ناقابل عمل رہبانیت اور ایک خواب آور افیون ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے مقصود وہ ضابطۂ قوانین ہے جس کے ماتحت زندگی بسر کرنے کیلئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ اور اسی ضابطہ کا نام قرآن کریم ہے۔ آج مادہ پرستی کے ماحول سے متاثر انسان جب ان الفاظ کو سنتا ہے تو ہنس دیتا ہے۔ لیکن خود "مادہ پرستی" ہی اب اس کے منہ پر وہ تھپڑ لگا رہی ہے کہ اس کے بعد اس کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔ دنیا کو خدا فراموشی (کہ جس کا نتیجہ خود فراموشی ہوتا ہے) کی سزا ملنی ضروری تھی۔ وہ مل رہی ہے۔ لیکن کارگاہ کائنات کی مرکزی قوتوں کا مالک۔ خدا۔ "رحمٰن"[1] ہے۔ نعوذ باللہ ظالم نہیں ہے۔ وہ دنیا کو تباہ نہیں ہونے دیگا۔ وہ انسانیت کو یوں بیچارگی میں نہیں چھوڑیگا۔ قرآن دنیا میں موجود ہے۔ بس ایک مرد مومن کی ضرورت ہے۔ جو دنیا کے سامنے قرآن پیش کر دے۔ اور قرآنی احکام کی ترویج وتنفیذ کیلئے اپنے پاس قوت رکھے۔ اسکے بعد یہ نظام عالم۔ فطرت کے خطوط پر چلیگا۔ اور انسانیت صراط مستقیم پر گامزن ہوگی۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ مرد مومن پیدا کہاں سے ہوتا ہے ؎

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے ⁂ مسکیں دلم ماندہ دریں کشمکش اندر

جیسا کہ ہم ابھی ابھی لکھ چکے ہیں۔ آج جبکہ ہر شخص کی نگاہیں رزمگاہ یورپ پر لگی ہوئی ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ دنیا میں کیا انقلاب آنیوالا ہے۔ کسی کو فرصت نہیں کہ معاملات پر بسکون قلب غور کرے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ مسلمانان ہند کیلئے وقت ہی اب آیا ہے۔ کہ پورے سکون وتحمل سے سوچیں کہ اس انقلاب میں ان کا کیا انجام ہونیوالا ہے۔ حالات بڑے نازک اور وقت بہت کم ہے۔

---

[1] الرحمٰن علی العرش استویٰ

ہمیں یقین ہے کہ اگر آج انہوں نے اپنے حالات پر سنجیدگی سے غور کر لیا تو کچھ عجب کہ یہی خطہ اس حکومت آلٰہیہ کی پرورش گاہ Nursery بنجائے جس کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا گیا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر ہم نے یہ پورا پرچہ اس ایک مضمون کیلئے وقف کر دیا ہے کہ جس کا عنوان۔ اور عنوان ہی نہیں بلکہ مفہوم ہے "جہان نو" اسے پاکستانی نظریہ کہئے۔ لیگ کی اسکیم نام رکھئے۔ علیحدگی کی تجویز قرار دیجئے۔ بات ایک ہی ہے۔ کہ ہمارے نزدیک یہ پیش خیمہ ہے حکومت آلٰہیہ کے قیام کا۔ اور اس لئے مسلمانان ہند کے گہرے غور و تدبر کا محتاج ہے۔ اس مضمون میں ان تمام اعتراضات کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو آج تک بیگانوں اور نام نہاد "اپنوں" کی طرف سے اس اسکیم کے خلاف عائد کئے گئے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر بے نقاب کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے اس بحران پر نگاہ نہ رکھی جس میں دنیا آج گذر رہی ہے۔ تو اسکے بعد پھر فطرت انہیں کچھ مہلت نہ دیگی۔ اور اسکی تعزیر کا ہاتھ انہیں حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالے گا۔

خدا سے پھرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ پنجاب کی جس زندہ سرزمین کو ہم حکومت آلٰہیہ کی اوّلین قیام گاہ قرار دے رہے ہیں۔ وہاں کس شدت اور سختی سے اس حکومت کے قیام کی مخالفت جاری ہے۔ لیکن یہی چیز ہماری امیدوں کو ایک نئی زندگی عطا کر رہی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ "خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!"

حادثۂ خاکساران کی تحقیقاتی کمیٹی کی روئداد کے دوران میں جن انسانیت سوز۔ وحشیانہ مظالم کا انکشاف ہوا ہے کونسی آنکھ ہے جو اس سے اشکبار اور کونسا دل ہے جو اس پر خوں فشاں نہ ہوگا۔ اور ابھی خاکساروں نے اس کمیٹی کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اور استبدادی قوانین کا پنجۂ آہنی حق کی آواز کو دبانے کیلئے ہر مقام پر موجود تھا ہمیں تو جیسا کہ ہم نے اپریل کے پرچہ میں لکھا تھا۔ کسی ایسی کمیٹی سے کوئی امید ہی نہیں۔ اسی لئے ہم نے گذارش کی تھی کہ لیگ کو چاہئے تھا کہ ایک آزاد تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرتی۔ اسلئے اس کمیٹی کی رپورٹ کو بھی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں لیکن جو کچھ بھی اس وقت سامنے آیا ہے (یعنی جو کچھ ۱۹ مارچ سے اسوقت تک لاہور میں ہو رہا ہے) اسکے پیش نظر ہم ان حضرات سے باادب دریافت کرتے ہیں جو حکومت پنجاب کی قصیدہ خوانی میں رطب اللسان ہیں۔ کہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ اگر یہی کچھ۔ یا اس سے کہیں کم۔

کسی ایسے صوبے میں ہوتا جہاں ہندوؤں کی حکومت ہوتی تو کیا یہ اسی طرح انکی تعریف و توصیف میں قصیدہ گوئی فرماتے! ذرا سوچئے تو سہی کہ یہ کیا قیامت ہے! ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ پاآخر یہ مسلمانوں کی حکومت کا صوبہ ہے۔ اسکی مخالفت مسلمانوں کی حکومت کی مخالفت ہے لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اگر موافقت و مخالفت کا معیار یہی قرار پا جائے تو پھر ایک دفعہ "مسلمان" نام رکھا لینے کے بعد دنیا میں برائی کا لائسنس ملجائیگا۔ اگر یہی معیار درست ہے تو بنی امیہ نے کیا جرم کیا تھا۔ وہ بھی تو مسلمان ہی تھے!

بہرحال آج ان مظالم کی مخالف آوازوں کو دبایا بھی جا سکتا ہے۔ اور اسکی تائید میں آوازیں خریدی بھی جا سکتی ہیں۔ لیکن آئیندہ مورخ جب آج کے حالات کا جائزہ لیگا۔ اور دیکھے گا کہ ایسے وقت میں جب قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے تھے۔ خود مسلمانوں نے اس جماعت کیساتھ کیا کیا جس کی تقویت میں اس قوم کی زندگی کا راز پوشیدہ تھا۔ تو اسوقت حق کی آواز کو کوئی نہ دبا سکے گا۔ سوچئے کہ وہ آپ کو کس صف میں کھڑا کر دیگا! ذرا سوچئے تو سہی کہ سکھ اپنے گردواروں کی لاکھوں روپے کی آمدنی سے فولادی دیوار بن رہے ہیں۔ روہتک اور حصار میں کروڑوں روپیہ قحط کے نقاب میں جاٹوں کی تنظیم کیلئے خرچ کیا جا رہا ہے۔ پھر پنجاب سے باہر دیکھئے تو ڈاکٹر مونجے کے ملٹری کالج اور کانگریس کے سیوک دل ہر مقام پر عسکری تنظیم میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ آئیندہ خطرات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو رہے ہیں۔ اور مسلمان ہیں کہ اپنی چھری سے اپنا ہی گلا کاٹ رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خاکسار حکومت وقت کے قانون مروجہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اسلئے ان پر جو سختی بھی کیجاتے روا ہے۔ گویا ایک مسلمان کیلئے ہر حکومت وقت کے ہر قانون مروجہ کی اطاعت بطور فریضہ کے عائد ہو جاتی ہے جس کی خلاف ورزی معصیت خدا و رسول ہے! پنجاب کے ایک اخبار نے ایک اور دلچسپ بات لکھی ہے۔ ارشاد ہے کہ علامہ مشرقی تو ایک ڈکٹیٹر ہیں جس کی اسلام میں کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی۔ سر سکندر حیات خانصاحب کا انتخاب رائے عامہ سے ہوا ہے۔ لہذا یہ امیر المومنین ہیں۔ خاکساروں کو چاہیئے کہ انکی اطاعت کریں۔ حالانکہ یہی اخبار جس میں یہ گوہر ریزہ شائع ہوا ہے آئے دن ڈاکٹر خانصاحب کی حکومت کی مخالفت کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اسی طرح مسلمانوں کی آراء سے منتخب ہوئے ہیں جس طرح سر سکندر حیات خانصاحب۔

انھیں امیر المومنین کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ طوفان برپا کیا جا رہا ہے کہ خاکسار مسجدوں میں جا کر پناہ لیتے ہیں اس سے مسجدوں کی بے حرمتی ہوتی ہے یعنی مساجد کی حرمت اسطرح قائم رہتی ہے کہ انکے گرد خاردار تاروں کی باڑ لگا دی جائے۔ اور نمازیوں کو اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ وہاں نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ اور پھر ان ناموس شعائر اسلامی کے محافظین سے پوچھئے کہ تمہارے سامنے شہید گنج کی مسجد میں سکھ ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔ اس سے تو تمہاری غیرت ملی میں حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ خاکسار اگر مساجد میں جا کر پناہ لے لیتے ہیں تو اس سے آپ کی رگ حمیت بہت جلد بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر غیرت ملی ہوتی تو شہید گنج کی اپیل خارج ہونیکے مسئلہ پر یہ "اسلامی حکومت" مستعفی ہو کر آ جاتی۔ لیکن یہاں تو غیرت مسلمانوں کے خون بہانیکے کام آتی ہے۔ دوسروں کے مقام میں غیرت کیوں آنے لگی۔ اور تماشا یہ کہ فتوے طلب کئے جاتے ہیں۔ کہ خاکساروں کا اسطرح مساجد میں جا کر پناہ لینا از روئے شریعت کیا ہے؟ لیکن کبھی یہ فتوی طلب نہیں کیا جاتا کہ حکومت نے خاکساروں کیخلاف جو پابندیاں عائد کر رکھی ہیں انکے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے! جب یہ معلوم ہو جائیگا کہ خاکساروں کیخلاف جو پابندیاں عائد کی گئیں ہیں وہ از روئے شریعت سراسر غیر اسلامی ہیں۔ کہ اسلام تو نام ہے سپاہیانہ زندگی کا۔ تو پھر ان پابندیوں کی خلاف ورزی سے جو مظالم ان پر عائد کئے جاتے ہیں انہیں ان سے جہاں پناہ ملیگی وہ جائینگے۔ اگر سانپ سے ڈر کر مسجد میں بند ہو جانا جرم نہیں تو حکومت پنجاب کے مظالم سے بچکر مساجد میں پناہ لے لینا کیسے جرم کہلا سکتا ہے؟

ہمارے نزدیک خاکساروں کا مسئلہ کچھ ایسا پیچیدہ نہیں ہے۔ جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ بشرطیکہ سمجھنے کی کوشش کیجائے۔ خاکساروں کے نزدیک عسکری پریڈ جزو مذہب ہے۔ اسلئے اس باب میں ان پر پابندیاں عائد کرنا مداخلت فی الدین کے مرادف ہے۔ موجودہ حکومت کا فریضہ زیادہ سے زیادہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اگر خاکساروں کو اس مذہبی فریضہ کی ادائیگی کی اجازت دی گئی تو اس سے دوسرے مذہبی فرقوں کی واقعی دلآزاری تو نہ ہوگی، یا یہ چیز امن عامہ میں خلل انداز تو نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کسی مذہبی فرقے نے ابتک یہ شکایت نہیں کی خاکساروں کی پریڈ سے ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ رہی دوسری شق۔ سو خاکسار دس سال سے پریڈ کرتے چلے آ رہے ہیں اس دس سال کے عرصہ میں کوئی ایک واقعہ ایسا نہیں ہوا کہ محض انکی پریڈ کی وجہ سے امن عامہ میں خلل واقع ہو گیا ہو

اب ظاہر ہے کہ جس جماعت کا فریضہ مذہبی ایسا ہو کہ نہ اس سے کسی دوسرے فرقہ کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے نہ کہیں امن عامہ میں خلل واقع ہوا ہو۔ بیٹھے بٹھائے ان پر ایسی کڑی پابندیاں عائد کر دینا کہاں کا اصول جہانداری ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ خاکسار ان پابندیوں کو مداخلت فی الدین سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ انہیں اپنا دین عزیز ہے۔ اسلئے ان پابندیوں کو اُٹھوانے کیلئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہیں۔ دوسری طرف حکومت ہے کہ وہ اپنے نشۂ قوت میں مست ہے کہ ہیں! ہمارا حکم اور اس کی یوں خلاف ورزی۔ محض ضد ہے۔ اور کچھ نہیں۔ حالانکہ حکومت کی دانش اطواری اس میں تھی کہ وہ سمجھ لیتی کہ ایک غلط فیصلہ تھا جو ہو گیا۔ خدائی فیصلہ تو تھا نہیں کہ اس میں سہو اور غلطی کا امکان نہ ہو۔ حکومت بیسیوں مرتبہ ایسے فیصلے کرتی ہے جن کی غلطیاں خود ان کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اور انہیں آئے دن ان فیصلوں کی ترمیمات جاری کرنی پڑتی ہیں۔ اگر اس فیصلہ کو ویسا ہی سمجھ لیا جاتا تو بات کبھی نہ بڑھتی۔ لیکن ضد کا کیا علاج!

کہدیا جائیگا کہ خاکسار بھی تو ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض کرتے وقت اس حقیقت کو بھلا دیا جاتا ہے کہ خاکساروں کے نزدیک یہ مسئلہ مداخلت فی الدین ہے۔ اسلئے ان کی "ضد" مذہبی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ برعکس اسکے حکومت کی ضد محض ناک (Prestige) قائم رکھنے کے لئے ہے۔ پابندیاں اُٹھا دینے سے خاکسار کوئی قیامت برپا نہیں کر دیں گے۔ اور اگر کریں گے تو عام قانون کی رو سے ان پر مواخذہ کیا جائیگا۔ محض پابندیاں عائد کرنیکی خاطر ایک نیا آئین بنا دینا اگر بے آئینی نہیں تو اور کیا ہے! ہم حکومت کو مشورہ دیں گے کہ وہ اب بھی اس حقیقت کو سمجھ لے اور خاکساروں سے پابندیاں اٹھالے محض طاقت کے زعم باطل میں دنیا کی کوئی حکومت نہ چل سکی ہے اور نہ چل سکے گی۔

پھر چونکہ خاکساروں کے نزدیک یہ مسئلہ مذہب سے متعلق ہے اسلئے اس باب میں نہ وہ کسی کی تائید کے محتاج ہیں نہ مشورہ کے طالب۔ ان کے نزدیک یہ مذہبی سوال اسلئے ہے کہ ان کے امیر کا حکم ہے۔ اس لئے اس باب میں ان کے امیر سے گفتگو کیجا سکتی ہے۔ ان کا امیر جیتا جاگتا موجود ہے۔ قید و بند کی چار دیواری اُسے اُسکے منصب امارت سے برطرف نہیں کر سکتی۔ یہ خاکساروں کا عقیدہ ہے۔ وہ امیر جن شعبوں کے متعلق اپنی جماعت کے اولوالامر حضرات کو اختیارات تفویض کر گیا ہے۔ ان میں وہ مجاز ہیں۔ باقی

(بقایا صفحہ ۸۰)

جہانِ نو

(علیحدگی کی اسکیم قرآنی روشنی میں)

در جہاں بال و پرِ خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتواں باپر و بالِ دگراں
آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز
آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں

باب اوّل

اسلام کی حقیقت

عام طور پر مذہب سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وہ انسان کی "روحانی ترقی" کا ذریعہ ہے۔ یعنی اسے دنیا جہاں کے دھندوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ بلکہ جب انسان دنیاوی بکھیڑوں سے فارغ ہو جائے تو کچھ وقت کے لئے اپنے خدا۔ ایشور۔ پرماتما کی طرف بھی دھیان کرے۔ اس "دھیان" سے اس کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوگی۔ جسے آتما شکتی یا تسکین روح کہا جاتا ہے۔ اسی کی ترقی کا نام نجات یا مکتی ہے۔ اس "تسکین روح" کے حصول کے ذرائع مختلف ہیں۔ ان ذرائع کو عبادت بھگتی یا (Prayer) کہا جاتا ہے۔ کسی نے محراب مسجد کے اندر سر جھکا لیا۔ کسی نے مندر میں دیوی کی پوجا کر لی۔ کوئی گرجا میں چلا گیا۔ بس یہ ہے مذہب کا دائرہ اور یہ ہے اس کی کائنات! جب انگریزوں نے اپنے تسلط کے بعد ہندوستان میں "مذہبی آزادی" کا اعلان کیا ہے۔ تو ان کا مطلب بھی اسی آزادی سے تھا۔ اور آج جب بساط سیاست انگریز کی طرف سے سکڑ کر ہندو کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ تو وہاں بھی مذہبی آزادی کا یہی مفہوم ہے۔

اور اسی کے تحفظات کی ضمانتیں دی جاتی ہیں۔ دوسرے مذاہب عالم میں مذہب کا جو تصور بھی ہو۔ ہمیں اس سے واسطہ نہیں۔ لیکن جہاں تک **اسلام** کا تعلق ہے۔ مذہب کا مذکورہ صدر مفہوم قطعاً غلط ہے **اسلام** یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک متعین ضابطۂ قانون کے ماتحت چل رہی ہے۔ اور اس میں ان کے ارادے اور اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ وہ مقررہ نہج کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اسی لئے یہ نظام کائنات ٹھکانے سے چلا جا رہا ہے۔ موجب عالم موجودات کی ہر شے اس اصول پر عمل پیرا ہے تو کیا انسان جو خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ جو نظامِ کائنات کا ماحصل ہے۔ فطرت کے اس غیر متبدل قانون کو مستثنےٰ ہوگا؟ کیا اس کے لئے ضروری نہیں ہوگا کہ یہ بھی ایک متعین نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے؟ ظاہر ہے کہ انسان کو بھی اسی اصول کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اس کو بھی ایک خاص نظام کے مطابق دنیا میں رہنا ہوگا۔ یہ نظام زندگی۔ یہ ضابطۂ قوانین۔ جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے **اسلام** کہلاتا ہے۔

لیکن انسان اور دیگر اشیائے فطرت میں ایک بیّن فرق ہے۔ دیگر مخلوق۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور و مقہور ہے۔ جو ان کے لئے بطور نظامِ حیات تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس انسان کو کچھ اختیار اور ارادہ بھی دیا گیا ہے اور اس معاملہ میں اسے ایک حد تک آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ اس کی یہی آزادی اور اختیار ہے۔ جو اسے دیگر مخلوق (مثلاً حیوانات وغیرہ) سے ممتاز کرتا ہے۔ اسے شعور و ادراک۔ عقل و دانش عطا کی گئی ہے۔ کہ وہ اپنی مرضی سے اس نظامِ حیات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہے یہی امتیاز اس کی سرفرازی اور سربلندی کی دلیل ہے۔ اسی سے یہ دنیا میں اپنے آپ کو تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ تصور کرتا ہے۔ اور بجا طور پر تصور کرتا ہے اس اختیار کے ساتھ اپنے آپ پر جبر کرنا۔ اس آزادی کے باوجود اپنے آپ کو قوانینِ متعینہ کے دائرہ حدود وقیود میں پابند کر لینا۔ اس کے اندر جوہرِ خودی کا استحکام پیدا کرتا ہے۔ اور

یہی استحکام منشائے فطرت ہے۔ اس سے یہ سلسلۂ ارتقا کی اگلی منازل طے کرنے کے قابل ہوگا۔ اس سے اس میں وہ صلاحیت پیدا ہوگی کہ یہ اس زندگی سے اگلی زندگی۔ اس سے نفیس ولطیف زندگی۔ اس سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرسکے۔ جسے اُخروی زندگی کہا جاتا ہے۔

لیکن انسان اپنے اس اختیار و ارادہ کو غلط بھی استعمال کرسکتا ہے۔ اس سے قوانین فطرت کی خلاف ورزی بھی عمل میں آسکتی ہے۔ یہ اس نہج و اسلوب سے سرکشی بھی اختیار کرسکتا ہے۔ جس پر چلنے کے لئے اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی اِس سرکشی و تمرد اس عدوان وطغیان کا نتیجہ کیا ہوگا! اس کے سمجھنے کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں (فی انفسکم؟ افلا تبصرون) فطرت کا قانون ہے کہ آپ کی زندگی کا مدار سانس پر ہے۔ ذرا اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ ناک اور منہ بند کر لیجئے' خود سمجھ میں آجائے گا۔ کہ اس کا نتیجہ کیا ہے! وقس علی ھذا۔ لیکن یہ حادثہ چونکہ آپکی مادی زندگی سے متعلق ہے۔ جس میں انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں۔ اس لئے اس کا نتیجہ۔ اس کا انجام۔ اس کی جزا۔ محسوس طرح سامنے آجاتی ہے۔ لیکن جب آپ ان قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ جن کا تعلق آپ کی "انسانیت" سے ہے۔ جس کی حدیں حیوانیت سے آگے بڑھ کر شروع ہوتی ہیں۔ تو اس کا نتیجہ غیر محسوس طور پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے جلدی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جھوٹ بولنا۔ ایسی ہی فطرت کی قانون شکنی ہے۔ جیسے سانس روک لینا۔ لیکن جہاں سانس روک لینے سے انسان کی جان پر بن جاتی ہے۔ وہ تڑپنے۔ پھڑکنے۔ بلبلانے لگ جاتا ہے۔ جھوٹ بولنے سے وہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے کوئی تکلیف ہوئی ہے۔ لیکن وہ محسوس کرے یا نہ کرے۔ نتیجہ تو برآمد ہو کر رہے گا۔ یہی وہ نتائج ہیں۔ جن کا مجموعی اثر انسان کی تمدنی۔ عمرانی معاشرتی۔ معاشی اخلاقی۔ سیاسی۔ "دینی۔ دنیاوی" غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کرتا ہے۔ اور انسان حیات اجتماعیہ کو انہی نتائج و عواقب کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اگر اس کی زندگی فطرت کے مطابق ہے تو اِس کا فطری نتیجہ ہے۔ کہ اس کی حیاتِ اجتماعیہ فردوس در آغوش

اور اگر اس کی زندگی ان قوانین فطرت کے خلاف بسر ہو رہی ہے تو وہ عدم طمانیت و فقدان سکون کے شعلہ بار جہنم میں جل رہا ہے۔ جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔

لہٰذا اس دنیا میں جنت کی زندگی سکون و طمانیت کی زندگی کا نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حیات انسانی کو ان قوانین کے ماتحت چلایا جائے۔ جس پر چلنے کے لئے وہ مخلوق ہوئی ہے۔ یعنی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ وہ نظام جسے **اسلام** کہا جاتا ہے۔ انسان کو اس نظام پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک تو وہ ضابطۂ قوانین موجود ہو۔ جس کے مطابق اسے چلایا جائے گا۔ اور دوسرے کوئی ایسی قوت موجود ہو جس کی بنا پر انسان کو ان قوانین کی خلاف ورزی نہ کرنے دی جائے۔ اس ضابطۂ قوانین کا نام ہے۔ "ہدایت خداوندی" اور اس قوت کا نام ہے "حکومت الٰہی" یا خلافت ارضی۔ فرمایا۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ	یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت
وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ	دیکر بھیجا۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنزَلْنَا	(کتاب) اور میزان عدل نازل کی۔ تاکہ نوع
الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ	انسانی توازن پر قائم رہے۔ اور ہم نے (ان
لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَ	چیزوں کی محافظت کے لئے) فولاد کی شمشیر
رُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ	بھی نازل کی جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے
عَزِيزٌ ۵۷/۲۵	اور لوگوں کیلئے منفعت۔ تاکہ اللہ یہ جان لے

کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غائبانہ مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ صاحب قوت و تدبیر ہے"

یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اس نظام خداوندی میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے کہ ایک طرف انسان کو آزادی اور اختیار کی نعمت سے سرفراز کیا جائے۔ اور دوسری طرف اس "جبر" سے اس نعمت کو واپس لے لیا جائے۔ ہم یہ بحث کسی دوسرے وقت پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ اگر کسی اندھے کو کنوئیں میں گرنے سے

زبردستی روک لینا۔ اس پر زیادتی نہیں ہے۔ کسی بچے کے ہاتھ سے بجبر چاقو چھین لینا۔ اس پر ظلم نہیں کہلا سکتا۔ کسی خودکشی کرنے والے کو گرفتار کرکے اس کے اِس اختیار کو اس سے سلب کرنا ناانصافی نہیں ہے۔ تو جاہل اور ظالم انسان کے لئے قوانین فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا انتظام کردینا یقیناً جور وتعدی نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ یہ تو اس کے ساتھ عین انصاف ہے۔ انصاف ہی نہیں۔ احسان بھی ہے۔ جب تقویم انسانیت کے نظم ونسق کا اسلوب و انداز یہ ٹھہرا۔ تو ضروری ہے کہ نوع انسانی میں ایک ایسی جماعت موجود رہے۔ جو ضابطۂ خداوندی کی وارث اور اس نظم ونسق کے قیام وبقا کی ذمہ دار ہو۔ اور اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ جماعت صاحبِ قوت و اقتدار بھی ہو۔ کہ اس کے بغیر اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ چنانچہ ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ جس وقت سے اللہ تعالےٰ نے سلسلۂ رشد وہدایت شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اِس امر کا بھی التزام رکھا کہ اس جماعتِ منتخبہ کو جو ضابطۂ قوانین کی وارث ہو۔ خلافت ارضی کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا جائے۔ سورۂ اعراف میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جہاں حضرت ہودؑ۔ حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کے سلسلۂ تعلیم کا ذکر ہے۔ وہاں ان کی اقوام کے متعلق یہ بھی تصریح موجود ہے کہ انہیں قوت واقتدار سطوت وحکومت بھی عطا فرمائی گئی تھی۔ انبیاء کسابقہ میں حضرت ابراہیمؑ کا گھرانہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ انہیں کتاب وحکمت کے ساتھ "ملک عظیم" کا بھی مالک بنایا گیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کے تمکن فی الارض کی صراحت سورۂ یوسف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم کی کشورکشائی وجہاں بانی کی شہادتیں قرآن کریم کے ورق ورق سے ملتی ہیں۔ لیکن یہ تمام سلسلہ کچھ اس نہج سے جاری رہا کہ یہ انبیاء کرام کسی خاص قوم۔ خاص ملک اور خاص زمانہ کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ ان کا ضابطۂ ہدایت کچھ وقت کے لئے محفوظ رہتا۔ پھر اس کے جدید اڈیشن کی ضرورت پڑ جاتی۔ اسی طرح ان کی قوم بھی ایک خاص وقت تک حامل کتاب آئی رہتی۔ اس کے بعد اس کی مخاطب کوئی دوسری قوم ہو جاتی۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ تاآنکہ انسانیت ارتقائی منازل

طے کر کے عہدِ شعور تک پہنچ گئی۔ یہ اب اس قابل ہوگئی کہ اسے ایک ایسا ضابطۂ آئینی دیدیا جائے جس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کو اپنا مخاطب قرار دے جس کا دائرہ نفوذ کوئی خاص خطۂ ارض نہ ہو بلکہ اس کی ہمہ گیر تعلیم تمام روئے زمین کو محیط ہو۔ جس کا زمانۂ عمل کوئی خاص عہد نہ ہو۔ بلکہ اس کی حدیں ابدیت سے ہم کنار ہوں۔ یہ وقت آیا تو خدائے رب العالمین کی طرف سے وہ رسولِ رحمت اللعالمین مبعوث ہوئے جنہوں نے آکر تمام نوعِ انسانی سے کہا۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔	اے نوعِ انسانی۔ میں تم تمام کی طرف اللہ کا پیام لیکر آیا ہوں۔

اور یہ اعلان صرف اس زمانے کے انسانوں کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ ان کے لئے بھی تھا جو ان کے بعد دنیا میں آنے والے تھے۔ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ (۶۲/۳) الجمعۃ۔

اس نے اللہ کی اس کتاب کو نوعِ انسانی تک پہنچایا جس کی تعریف یہ تھی کہ

ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ۔	تمام دنیا کے لئے نصیحت

اس ضابطۂ آئینی کی وراثت کے لئے نوعِ انسانی میں سے ایک خاص جماعت کو منتخب کیا گیا۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ (۳۵/۳۲)	پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کیلئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کر لیا۔

اور اس جماعت کو قوانینِ خداوندی کی حفاظت و تنفیذ کے لئے حکومت و مملکت کی شمشیرِ خارا شگاف (حدید) سے بھی متمتع فرمایا۔

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا۔ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا۔ (۳۳/۲۷)	اور اس نے تم کو تمہارے دشمنوں کی زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا۔ اور اس سرزمین کا بھی جہاں

تمہارے ابھی قدم بھی نہ پہنچے تھے۔ اور اللہ ہر شے پر قدرت اور اختیار رکھتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی اُن سے یہ بھی فرمادیا کہ یہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا۔ کہ تمہیں یوں سطوت شوکت حاصل ہوگئی۔ بلکہ یاد رکھو کہ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ یہ فطرت کا غیر متبدل قانون ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (سورہ نور)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں۔ اور اعمال صالحہ کریں۔ اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اس زمین کی حکومت عطا فرمائے گا۔ جس طرح ان سے پیشتر اس نے (ان شرائط کو پورا کرنے والوں کو) حکومت عطا فرمائی تھی اور ان کے اس دین کو جو ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ ممکن کر دیگا۔ اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا۔ (تاکہ) وہ صرف میرے ہی محکوم ہوں اور میری (حکومت) میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد باغی گزرا ہوگا تو اس کا شمار فاسقین میں سے ہوگا۔"

اس جماعت کو کتاب و حکومت کا وارث بنانے کے بعد بتادیا کہ ان کا فریضہ حیات کیا ہے۔ فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم وہ بہترین قوم ہو جو تمام نوع انسانی کی (رہنمائی) کی خاطر پیدا کی گئی ہو (تمہارا فریضہ حیات یہ ہے کہ) تم قوانین الٰہیہ (معروف[1]) کا حکم کرو۔ اور ان لوگوں کو اس کے خلاف دوسری باتوں (منکر[2]) سے روکو۔"

---

[1] معروف کا ترجمہ بالعموم نیکیاں۔ اور [2] منکر کا ترجمہ برائیاں کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے نیکی وہ ہے جس کا قرآن حکم دے اور برائی وہ جس سے وہ روکے نیکی اور بدی کا یہی ایک معیار ہے۔ اسلئے ہم نے ان الفاظ کا ذرا واضح ترجمہ کیا ہے

دیکھئے! یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تمہارا فریضہ یہ ہے۔ کہ تم لوگوں کو امورِ معروف کے متعلق وعظ و نصیحت کرو۔ بلکہ فرمایا۔ کہ تم ان باتوں کا حکم دو (تامرون) اور ظاہر ہے۔ حکم وہی دے سکتا ہے۔ جو صاحبِ حکومت ہو۔

یہ ہے اسلام۔ اور یہ ہے ملّت اسلامیہ کا فریضۂ زندگی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس مذہب سے حکومت کو الگ کر دیا جائے تو باقی وہی کچھ رہ جاتا ہے۔ جو انگریز اور ہندو نے مذہب کا مفہوم سمجھا ہے۔ یعنی ایشور بھگتی۔ خدا کی پوجا۔ گرجا کی (Prayer) عبادات و رسومات۔ لیکن یہ اسلام تو نہیں رہے گا۔ خلافت ارضی کے بغیر اسلام کا تصوّر ہی باطل ہے۔ اور مسلمان کہلاتے ہوئے کسی اور کا محکوم ہونا۔ اور اس محکومیت پر قانع ہو جانا عملی شرک ہے پس جس طرح ضابطۂ خداوندی سے الگ ہو کر حکومت محض فرعونیت رہ جاتی ہے۔ اسی طرح "عصا" کے بغیر "کلیمی" بھی رہبانیت بن جاتی ہے۔ فرعون کی **مملکت** اور حضرت موسیٰؑ **ضابطۂ** شریعت۔ ان دونوں کا نام ہے۔ اسلام۔ وہ اسلام جو اپنی کامل و مکمل شکل میں اس وقت ظاہر ہوا۔ جب وہ مثیل موسیٰؑ۔ وہ دعائے خلیلؑ۔ وہ نوید مسیحؑ۔ "دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ" مکہ کی وادیوں میں بایں شان و جلال جلوہ پیرا ہوا۔ کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں شمشیر تھی۔ تمام ملک میں قوانین آلٰہیہ کا سکہ جاری تھا۔ خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہ تھی۔

اس وقت اس نے پکار کر کہا۔ کہ ہاں۔

اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ کَھَیْئَتِہٖ	آج زمانہ پھر پھرا کر وہیں آ گیا۔ جہاں
یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ	یہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت
وَالْاَرْضَ ط (او کما قال علیہ)	تھا یعنی ہر شئے قوانین فطرت کے مطابق
بروایت ابوبکرہ	عمل پیرا ہو گئی۔

یہ ہے اسلام جس میں زمامِ حکومت انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں۔ بلکہ خود اللہ کے

ہاتھ میں ہوتی ہے جس کا فرمان ہے کہ

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۔ حکومت صرف اللہ کیلئے ہے ۔ اور بس ۔

لہذا اس حکومت کو نہ (انسانوں کی وضع کردہ) دستوری شہنشاہت (Monarchy) سے کچھ واسطہ ہے نہ خود مختار ملوکیت (Autocracy) سے ۔ نہ جمہوریت (Democracy) سے کچھ علاقہ ہے ۔ نہ آمریت (Dictatorship) سے ۔ نہ اس میں قوانین وضع کرنے کا اختیار اکثریت کے ہاتھ میں رہتا ہے ۔ نہ کسی ہائی کمانڈ کی تفویض میں ۔ اس جماعت کا کام جو اس حکومت آہنیہ کے قیام و بقا کی ذمہ دار ہوتی ہے ۔ قوانین خداوندی کی تنفیذ و ترویج ۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں فروعات کی ترتیب و تدوین ہوتا ہے ۔ اور بس ۔ اگر مسلمان کو اس قدر آزادی حاصل ہو تو پھر اس کا مذہب آزاد ہے ۔ ورنہ نماز روزہ کی آزادی بے معنی ہے ۔ آزادی وہی ہے جس میں حکومت آہنیہ کا قیام ہو سکے ۔ اور حکومت بھی ایسی مستقل بالذات کہ داخلی اور خارجی تمام امور متعلقہ میں کسی دوسری طاقت کا دخل اثر نہ ہو ۔ اس لیئے کہ حکومت آہنیہ میں انسانی قوت و اقتدار کا امتزاج تو ایک کھلا ہوا شرک ہے ۔ پھر اس حکومت آہنیہ کے قوانین کی رو سے انسانوں کی تقسیم ۔ عام انسانی معیار تفریق و تمیز ۔ یعنی نسانی نسلی ۔ جغرافیائی حدود سے برعکس ۔ ایک جداگانہ معیار کے مطابق طے پاتی ہے یعنی وہ تمام انسان جو اس حکومت آہنیہ کے دائرہ میں آتے جائیں (بالفاظ دیگر اسلام قبول کرتے جاتے ہیں) وہ بلا لحاظ نسل ۔ رنگ ۔ وطن ۔ ایک بنتے جاتے ہیں ۔ اور ان کے مقابلہ میں تمام دوسرے انسان ایک الگ قوم قرار پاتے ہیں ۔ اولذکر جماعت کو ملت اسلامیہ ۔ جماعت مومنین کہا جاتا ہے ۔ اور ثانی الذکر غیر مسلم ۔ جمعیت کفار کہلاتے ہیں ۔ جس طرح کسی حکومت کے کاروبار میں کسی ایسے شخص کو بار یابی نہیں ہو سکتی ۔ جو اس حکومت کا باغی ہو اسی طرح حکومت آہنیہ کے نظم و نسق میں کسی غیر مسلم کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہو سکتا ۔ یہی وجہ ہے

کہ مسلمانوں کے امورِ حکومت، (شوریٰ بینھم) کے آپس کے باہمی مشورہ سے طے پا سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا ان کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح ان کا صاحبِ امر بھی لامحالہ انہی میں سے ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کہ اولی الامر منکم (تم میں سے) کی شرط لاینفک ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں اسلام کے عناصرِ ترکیبی اور اصول و مبانی۔ انہیں پیشِ نظر رکھئے۔ اور ان کی روشنی میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل پر غور کیجئے۔ بات خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔

باب دوم

سیاست ہندیہ اصول بالا کی روشنی میں

صفحات گذشتہ میں ہم نے اسلام و مسلمانوں کے متعلق جو کچھ حقائقِ قرآنی کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس کی صحت میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جب حقیقت وہی ہے۔ جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان جس حالت میں آج ہے وہ صرف نام کا مسلمان ہے۔ اپنی حکومت کے بغیر یہ کبھی صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جن حالات میں ہم یہاں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر ہم اس "عہدِ جاہلیت" سے "عہدِ اسلامی" کی طرف کیسے آ سکتے ہیں۔ مسئلہ زیرِ نظر کا حل ایک بڑی حد تک اسی سوال کے صحیح جواب پر موقوف ہے۔ اور اس لئے دقتِ نظر کا طالب۔ اس مقصد کے لئے ذیل کی چند اہم شقوں کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

---

(۱) ہندو کا دعویٰ ہے (اور ہم اس وقت اس دعوے کی حقیقت پر بحث نہیں کرنا چاہتے)

کہ تحریک آزادی سے مقصود یہ ہے۔ کہ ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کیجائے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مسلمان کسی کا محکوم رہ کر صحیح معنوں میں مسلمان کہلا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے جہاں تک انگریزوں کی (یا کسی اور کی) حکومت کا تعلق ہے۔ مسلمان از روئے قرآن اس امر پہ مامور ہے۔ کہ اس غلامی سے آزادی حاصل کرے۔ لہذا اس شق میں مسلمان ہندو سے بھی زیادہ اس امر کا متمنی ہے کہ غلامی کا طوق لعنت اس کی گردن سے اتر جائے۔

(۲) ہندو کا دوسرا دعویٰ یہ ہے۔ کہ ہندوستان ایک واحد ملک ہونے کی جہت سے ایک کل (Unit) ہے۔ اور اس میں بسنے والے تمام انسان ایک "قوم" ہیں۔ موجودہ نظام حکومت کے بعد جدید طرز حکومت (یعنی دور آزادی کا طرز حکومت) جمہوری ہوگا یعنی جملہ امور کے فیصلے اس مزعومہ "قوم" کے نمائندوں کی اکثریت سے طے پائیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اکثریت یہاں بہرحال ہندوؤں کی ہوگی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

(۳) ہندوستان کے مستقبل کے آئینی نظام کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ انگریزوں کے زیر سایہ درجۂ نوآبادیات (Dominion Status) مل جائے (ہندو یہی چاہتا ہے) اور دوسرے یہ کہ انگریزوں کے عمل و دخل کے مکمل انقطاع کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے (قرائن و شواہد اسی پر دال ہیں کہ ہندو یہ نہیں چاہتا) دونوں صورتوں میں سے کوئی شکل بھی پیدا ہو۔ ہندو کے ارادوں کے مطابق نظام حکومت کی تشکیل یوں ہوگی کہ تمام ہندوستان کا ایک مرکز (Centre) ہوگا۔ اور تمام اہم شعبہ ہائے نظم و نسق کے اصول اس مرکز سے متعین ہوں گے۔ اور جمہوری اندازِ حکومت کے ماتحت یہ فیصلے اکثریت کی آراء کے تابع ہوا کریں گے۔

(۴) اس نظامِ حکومت میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" دی جائے گی یعنی اس چیز کی آزادی جسے ہندو "مذہب" سمجھتا ہے۔ بعینہٖ جیسے آج کل انگریزوں کی حکومت میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" حاصل ہے۔ یعنی اس چیز کی آزادی جسے انگریز "مذہب" سمجھتا ہے۔ نماز

روزہ کی آزادی۔ مدح صحابہ و تبرّیٰ کی آزادی۔ عرسوں کی آزادی۔ تعزیہ کی آزادی۔ قرآن پڑھ پڑھ کر اس کے ایصالِ ثواب کی آزادی۔ سوا لاکھ مرتبہ آیت الکرسی پڑھنے کی آزادی۔ سبحہ شماری کی آزادی۔ ڈاڑھی بڑھانے کی آزادی۔ ختنہ کی آزادی، عقیقہ کی آزادی۔ غرضیکہ پوری "مذہبی" آزادی ہوگی۔ البتہ امورِ دنیاوی کے فیصلے اکثریت کے ماتحت ہوں گے۔ یعنی ملک میں (جس میں مسلمان بھی شامل ہیں) اقتصادی نظام کیسا ہوگا، سودی کاروبار کی نوعیت کیا ہوگی۔ دولت اور زمین کی تقسیم کیسے ہوگی۔ بیرونِ ہند کی اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ امن و جنگ کی حالت میں تعلقات کیسے ہوں گے۔ صلح کس سے ہوگی اور دشمنی کس سے۔ عدالتوں کا نظم و نسق کیسے ہوگا۔ ترازو سے عدل و انصاف کی تفویض کس معیار پر ہوگی کسی فعل کو جرم قرار دینے جانے کا تعین کون کرے گا۔ جرائم کی سزا کیا ہوگی۔ غرضیکہ اس قسم کے تمام "امورِ دنیاوی" کے فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہوں گے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کے نظامِ حکومت میں مسلمانوں کی حالت کیا ہوگی؛ کیا وہ اس نہج زندگی میں اپنے آپ کو "آزاد مسلمان" (بلکہ یوں کہیے کہ صحیح معنوں میں مسلمان) کہلانے کے مستحق سمجھیں گے؟ اس کے برعکس مسلمان کا یہ دعویٰ ہے کہ

(۱) از روئے کتاب و سنت۔ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوستان کے تمام باشندے ایک "قوم" نہیں ہیں۔

(۲) تمام ہندوستان کو ایک "کل" (Unit) فرض کر کے جمہوری انداز کا طرزِ حکومت مسلمانوں کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ کہ مسلمان کا نصب العین حکومتِ الٰہیہ کا قیام و بقا ہے۔ جو اس کی عملی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہو۔ "دین و دنیا" کی تفریق اس کے نزدیک غیر اسلامی نظریہ حیات ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ تمام ہندوستان کو ایک "کل" (Unit) اور یہاں کے

تمام باشندوں کو ایک قوم تصور کر لینے کے بعد جس انداز کا نظامِ حکومت ہندو قائم کرنا چاہتا ہے، وہ مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے ناقابلِ قبول ہے۔ تو پھر۔ بحالاتِ موجودہ مسلمان کس انداز کا نظامِ حکومت چاہتے ہیں۔ اس کے لئے دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اس وقت جب نظامِ حکومت انگریزوں کی زیر سرپرستی درجہ نوآبادیات کا ہو۔ (جیسا کہ سردست حالات بتا رہے ہیں) اور دوسرا اس وقت جب نظامِ حکومت بالکل آزاد ہو۔ (جو مسلمانوں کا از روئے مذہب منتہائے نگاہ ہے) مسلمان چاہتا ہے۔ کہ اول الذکر صورت میں یہاں دو یا دو سے زیادہ الگ الگ مراکز (Centres) قائم کئے جاویں۔ ایک ہندو انڈیا کے لئے اور دوسرا مسلم انڈیا کے لئے یعنی ایک مرکز میں اکثریت ہندوؤں کی ہو۔ اور دوسرے مرکز میں مسلمانوں کی۔ اور ثانی الذکر صورت میں ہندوستان کے دو الگ الگ خطوں میں جداگانہ آزاد سلطنتیں قائم ہوں۔ یہ ہے مسلمانوں کا مطمحِ نگاہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نظریہ کی عملی تشکیل کیسے ہو سکتی ہے۔ اتفاق سے ہندوستان کے شمال مغربی۔ اور شمال مشرقی (بنگال۔ آسام) کے علاقوں میں دو بڑے خطے ایسے واقع ہوئے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ اگر ہندوؤں اور انگریزوں کے نظریات کے مطابق اکثریت کو یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ اپنا نظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھے تو اس حصۂ ملک کی اکثریت سے یہ حق کیوں سلب کر لیا جائے؟ مسلم لیگ کی تجویز یہ ہے کہ جس دوران میں ملک میں آئینی تبدیلیاں ہوں۔ ان خطوں میں ایک (یا دو) جداگانہ مرکز قائم کر کے مسلمان اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ اور جب مکمل آزادی حاصل ہو جائے۔ تو یہی علاقہ آزاد اسلامی حکومت کی جولانگاہ بن جائے۔ اوّل الذکر اسکیم۔ مسلم لیگ کے ریزولیشن (لاہور) کا ماحصل ہے۔ اور ثانی الذکر ہمارے تصورات کی آماجگاہ۔ (اوّل الذکر بھی درحقیقت اسی ثانی الذکر کا پیش خیمہ ہے) اور دونوں کا سرچشمہ اس مردِ حق بین و حق آگاہ کی دانشِ نورانی و حکمتِ برہانی کا رہینِ منت ہے۔ جس نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر پوری جرأت بسالت سے اس کا اعلان

فرمایا۔ نوراللہ مرقدہٗ ورفع اللہ مقامہٗ

زباں پہ بارِ خدایا یکس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

باب سوم

اعتراضات

ہندوؤں کی طرف سے اس اسکیم کی مخالفت ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی۔ کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی (اقبالؒ)

انھوں نے اس کے خلاف جس قدر ہنگامہ آرائی اور غوغا آرائی سے کام لیا۔ وہ کوئی غیر متوقع اور تعجب انگیز واقعہ نہیں تعجب تو بلکہ اس پہ ہوتا اگر وہ خاموش رہتے۔ ہندو کی تمام جدوجہد اس امر کے حصول کے لئے ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر ہندو راج قائم کر کے اپنی صدیوں کی غلامی کا انتقام مسلمان اور تنہا مسلمان سے لے۔ اس نے جب دیکھا کہ اس اسکیم کی رو سے اس کے یہ تمام منصوبے خواب پریشاں ہو رہے ہیں۔ تو وہ تلملا اٹھا۔ اور اپنی قدیم روش کے مطابق "لوٹ لیا، مار لیا، دوڑیو، بچائیو" کے شور سے ایک ایسا ہنگامہ برپا کر دیا کہ جس سے وائسرےگل لاج سے لے کر قصر بکنگھم تک کی دیواریں ہل جائیں۔ یہ سب کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ اور اس کا کوئی گلہ نہیں شکوہ نہیں۔ لیکن جس بات کا رونا ہے وہ اس سے الگ ہے۔ جس قیامت کا ماتم ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ مصیبت یہ نہیں کہ ہندو اس کی مخالفت میں یوں آتش درپیرہن کیوں ہو رہا ہے۔ مصیبت یہ ہے۔ کہ یہ سب مخالفت خود غلام فطرت مسلمانوں کے ہاتھوں سے

کرائی جارہی ہے۔ مسلمانوں کو جو زخم غیروں کے ہاتھوں سے لگ رہے ہیں۔ تکلیف ان کی بھی ہوتی ہے۔ کہ زخم بالآخر زخم ہے۔ لیکن قیامت تو اس وقت برپا ہوتی ہے۔ جب یہ دکھائی دے کہ جس ہاتھ میں خنجر ہے۔ وہ ہاتھ ایک مسلمان کا ہے۔ حضرت عمرؓ کو جب بحالتِ نماز زخمی کیا گیا۔ تو انھوں نے سب سے پہلے یہی دریافت فرمایا تھا کہ حملہ آور کون ہے۔ اور جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان نہیں تو سجدۂ شکر بجا لائے۔ کہ الحمد للہ میرا قاتل کوئی مسلمان نہیں۔ لہذا جب یہ دیکھا جائے۔ کہ ملّت کی رگِ جاں پر جو خنجر رکھا جا رہا ہے۔ وہ خنجر ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہے۔ تو اندازہ فرمایئے کہ یہ منظر کس درجہ کرب انگیز اور یہ حادثہ کیسا جانکاہ ہوگا۔

اور پھر یہ ننگِ اسلام "مسلمان" اس مخالفت میں چاروں طرف سے اس طرح یورش کر کے امنڈے ہیں گویا کسی نے بھڑوں کے چھتہ میں پتھر دے مارا ہو۔ ان کی ان ہنگامہ خیزیوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ کہ جب قرآنِ کریم نے فرمایا تھا۔ کہ

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ   جب اللہ کا بندہ ان لوگوں کو حق کی طرف

كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ؕ   دعوت دینے کے لئے کھڑا ہوا۔ تو مخالفین

نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کہ گویا ابھی اسے لپٹ جائیں گے"۔

تو یہ صرف کسی خاص واقعہ کا ہی بیان نہ تھا۔ بلکہ ایک حقیقتِ مستمرہ کا اظہار تھا۔ کہ جب اور جہاں کہیں کوئی اللہ کا بندہ اسلام کی سرفرازی و سربلندی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ تو مخالف قوتیں اسی طرح ہجوم کر کے اسے گھیر لیتی ہیں۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم۔ جواں ہیں لات و منات   (اقبالؒ)

اور پھر قیامت بالائے قیامت یہ کہ اس لشکرِ بلا انگیز کا مقدمۃ الجیش مشتمل ہے ان حضرات پر جو بڑے بڑے جبّوں اور عماموں سے آراستہ۔ طویل اور عریض عباؤں اور قباؤں سے مزین۔ پشت پہ کتابوں کا طومار اٹھائے۔ بغلوں میں (قرآن نہیں بلکہ) قرآن کے جزدان دبائے۔ حمایتِ

دین اور حفاظتِ اسلام کے نعرے لگاتے اس "ملحد و بے دین" کے تعاقب میں بڑھے جا رہے ہیں جس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آزاد اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہی ہیں وہ قالب کہ جنہیں جعفر اور صادق کی روحیں تلاش کر کے اپنا نشیمن بنا لیتی ہیں۔ یہی ہے وہ طائفہ کہ جس نے اپنے زہد و تقدس اور علم و فضل کی نظر فریب قباؤں میں وہ خنجر و سناں چھپا رکھے ہیں۔ کہ ملتِ اسلامیہ کا یہ نور سینہ جن سے ہمیشہ چھلنی ہوتا رہا ہے۔ یہی ہے وہ گروہ جس کی یہ حالت ہے کہ

گاہ او را با کلیسا سازبا ز　　　گاہِ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ او آئینِ او سوداگری است　　　عنتری اندر لباسِ حیدری است
تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر　　　رسمِ او آئینِ او گردد دگر
پیش ازیں چیزے دگر مسجودِ او　　　در زمانِ ما وطن معبودِ او
ظاہرِ او از غمِ دیں دردمند　　　باطنش چو دیریاں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است　　　ایں مسلمانے کہن ملت کش است
از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم　　　ملتِ او از وجودِ او لئیم
ملتے را ہر کجا غارت گرے است　　　اصلِ او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں　　　(اقبال ؒ)

ہمیں اس تلخ نوائی سے معاف رکھئے کہ جب قرآن کو ڈھال بنا کر مسلمان کے سینہ میں خنجر گھونپا جاتا ہے۔ تو منہ سے بے اختیار چیخ نکل جانا کوئی جرم نہیں۔ آہ! ہم اپنا سینہ کسے دکھائیں اور کس سے ان رستے ہوئے ناسوروں کی مرہم طلب کریں۔ جو خود چارہ ساز کے نشتر کے رہین منت ہیں۔ بھڑک اٹھنے والی آگ کو تو ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ لیکن اس آتشِ خاموش کو کوئی کیسے دکھائے جو اندر ہی اندر مغزِ استخوان تک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دے۔

لیکن اس کا دھواں تک بھی سطح سے ابھرنے نہ پائے۔ ہم جب بھی اپنے بھائیوں کے خلاف کچھ لکھتے ہیں۔ تو شاید یہ سمجھا جاتا ہو۔ کہ ہمیں اس میں کچھ لطف آتا ہے۔ لیکن ہم کسے اپنا دل چیر کر دکھائیں۔ کہ اس قسم کے شکوہ شکایت سے خود ہم پر کیا گذرتی ہے یقین مانئے ہم ہر بات کو دیکھتے ہیں اور چھاتی پر پتھر رکھ کر اسے برداشت کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں۔ کہ کوئی ایسی اصلاح کی صورت نکل آئے۔ کہ ہمیں حرف شکایت زبان پر لانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لیکن جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کشتی کے مسافر خود اپنے ہاتھوں سے کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں اگر ہم چندے خاموش رہے تو پوری کی پوری کشتی غرق ہو جائے گی۔ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ گھر کے بسنے والے خود اپنے ہاتھوں سے گھر کو تباہ کر رہے ہیں یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ۔ ہے۔ اور خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم نے ان کا ہاتھ نہ پکڑا تو یہ بنیادوں تک کو منہدم کر دیں گے۔ تو اس وقت ہم زبان کھولنے اور ہاتھ پکڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں (اور بطور تحدیث نعمت عرض کرتے ہیں کہ ایسے وقت میں کسی ترغیب یا ترہیب کسی مصلحت کوشی یا جنبہ داری کے کانٹے آج تک ہمارے دامن کو نہیں الجھا سکے۔ یہ صرف اسی کا کرم ہے جسے وہ نوازے) ہم بھی جانتے ہیں کہ عفو و درگزر، مسامحت اور چشم پوشی اچھے اخلاق ہیں لیکن جب آپ دیکھ رہے ہوں۔ کہ ایک شخص مکان میں آگ لگا رہا ہے۔ تو اس وقت دیکھتے رہنا اور اس کا ہاتھ نہ روکنا۔ دنیا کے کسی معیار کے مطابق بھی مستحسن قرار نہیں دیا جائے گا۔ قومیں تباہ اس وقت ہوتی ہیں۔ جب انہیں غلط راستہ سے ٹوکنے والا کوئی باقی نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں مختلف امیال و عواطف کا تقاضا ٹھیک کچھ اور ہوتا ہے لیکن فریضۂ خداوندی کچھ اور چاہتا ہے۔ اور مبارک ہیں وہ کہ ایسے وقت میں جن کے ادائیگی فرض کے راستہ میں مختلف رجحانات مزاحم نہ ہو جائیں۔ وذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ

یقین مانئے۔ نہ ہمیں اشخاص سے کچھ تعلق ہے۔ نہ جماعتوں سے کچھ واسطہ۔ ہماری موافقت ہے تو اور مخالفت ہے تو سب ایک اصول کے ماتحت ہے۔ اور وہ اصول۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ صرف ایک ہے۔ کہ موافقت اس کی جو حق پر ہو اور مخالفت اس کی جو اس راہ کو چھوڑ کر باطل کے پیچھے لگ جائے۔ اگر عوام اس باطل کے راستے پر لگ جائیں تو زیادہ خدشہ نہیں ہوتا۔ کہ ایک تو عوام

کا عمل ان کی ذات تک محدود رہتا ہے اور دوسرے انہیں ہر وقت راہِ راست کی طرف بلایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب کشتی کے ناخدا ہی اسے بھنور کی طرف دھکیل لے جائیں۔ جب انجن کا ڈرائیور ہی اسے پٹری پر سے اتار دے تو پھر ہلاکت سے بچنے کی کونسی شکل باقی رہ جاتی ہے۔ اس لئے ایسے وقت میں خطرہ سے آگاہی کے ناقوس کا زیادہ بلند آہنگ اور روکنے والے ہاتھ کی گرفت کا زیادہ شدید ہو جانا بالکل فطری ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ ○

اور یقیناً اس میں عبرت ہے اس کے لئے جو (سینہ میں) دل رکھتا ہو اور اسے کان دیکر سنے اور اس پر گواہ رہے۔

اعتراض اوّل اب آئیے اعتراضات کی طرف۔ جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس اسکیم کا نقطۂ ماسکہ پنجاب ہے۔ کہ پنجاب ہی اس اسلامی خطہ کا قلب ہوگا۔ پنجاب کا مسلمان اس خواب کی تعبیر کے لئے ہمہ تن اضطراب ہے اور اس نصب العین کے حصول کے لئے ہر ممکن قربانی کے لئے تیار۔ پنجاب کے مسلمان کے سینہ میں دل اور دل میں زندہ رہنے کے ولولے موجزن ہیں۔ اس کی رگوں میں خون اور خون میں ایمان کی حرارت ہے وہ زندہ ہے۔ متحرک ہے۔ بیتاب ہے ایک پیکر جذبات ہے جو تحفظ ناموس اسلام کی خاطر ہر وقت کٹ مرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کا سیاسی شعور ہنوز اتنا بیدار نہیں ہوا کہ وہ اپنی نمائندگی کے لئے ایسے مسلمان منتخب کرے جن میں یہی جذبات بدرجۂ اولےٰ موجود ہوں۔ اس لئے عام طور پر وہ بساطِ سیاست پر دھوکا کھا جاتا ہے۔ اور اس کا بری طرح خمیازہ بھگتتا ہے۔ اسکیم زیرِ نظر کی جلد از جلد کامیابی کے لئے پنجاب کا ذرہ ذرہ مضطرب و بیقرار ہے۔ لیکن اس کمی کی وجہ سے جس کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ہے۔ باہر کی دنیا یہ سنکر متعجب رہ گئی کہ اس کی مخالفت کی ابتدا بھی پنجاب ہی سے ہوئی۔ اور وہ بھی خیر سے وہاں کے وزیرِ اعظم کی زبان سے۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی بدبختی کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ اس کی "زبان" اس کے

"قلب" کی مخالفت پر اتر آئے۔ یہ اسکیم ابھی لیگ کے ارباب بست وکشاد کے طبقہ میں گردش کر رہی تھی اور اسے اپنی آخری صورت میں ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے کھلے اجلاس میں جلوہ پیرا ہونا تھا کہ اوائل مارچ میں جناب سر سکندر حیات خاں صاحب نے اسلامیہ کالج کے ایک جلسہ کی تقریب پر طلباء کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ تم نے کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشا یہ ہو کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کر لیا جائے۔ یہ اسکیم نہ صرف اسلامی تعلیم کی صحیح روح کے ہی خلاف ہے۔ بلکہ اسلام کے اس بنیادی اصول کے بھی منافی ہے۔ جس کی رو سے ہر فرزند توحید پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچا دے۔ (ہندوستان ٹائمز ۵ مارچ)

یہاں سے ابتداء ہوئی اور اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ قومیت پرست طبقہ بالخصوص احرار اور جمعیت العلماء کی طرف سے ہر چہار سمت سے یہی مصرع اٹھایا گیا۔ کہ ہاں! یہ اسکیم اسلام کے خلاف ہے لیکن حرام ہے جو اس وقت تک سر سکندر حیات خاں صاحب یا ان کے مقلدین میں سے کسی اور نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کوئی ایک دلیل بھی پیش کی ہو۔ گویا یہ ایک فتویٰ تھا جو بلا دلیل و حجت بارگاہ وزارت سے صادر ہو گیا۔ اور اس کے نیچے حضرات "علماء کرام" الجواب صحیح لکھ کر مہر تصدیق ثبت فرماتے گئے۔ ہم نے باب اول میں جو کچھ لکھا ہے۔ اسے ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے اور اس کے بعد فیصلہ فرمائیے کہ کیا اس سے بڑا جھوٹ بھی ہے جو کبھی بولا گیا ہو اور اس سے بڑی تہمت بھی ہے جو اسلام پر لگائی گئی ہو کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا خیال اسلام کے خلاف ہے۔ حیرت ہے کہ اگر مسلمان کی حکومت کا تصور اسلام کے خلاف ہے۔ تو پھر کیا غلامی کا نظریہ اسلام کے مطابق ہوگا۔ یہ حضرات جو کچھ ان کے جی میں آتا اس اسکیم کے خلاف کہتے۔ لیکن کم از کم اللہ کے دین کے خلاف اس کے پیام ازلی کے خلاف۔ اس کے ضابطہ حکومت کے خلاف تو اس دیدہ دلیری سے کام نہ لیتے ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان پر اس لئے بھی اللہ کا عذاب طاری ہے۔ کہ اس نے اس کی کتاب عظیم

کو (نعوذ باللہ) کھلونا بنا رکھا ہے۔ ہر شخص اپنے خیالات و خواہشات کی اتباع کرتا ہے۔ بیکن چاہتا یہ ہے کہ اسے قرآنِ کریم کے مقدس غلاف میں لپیٹ کر پیش کرے تاکہ ہر سننے والے کا سر خود بخود اس کے سامنے جھک جائے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کا "تلعب بالدین" اللہ کے ہاں کسی رعایت کا مستحق ہو سکتا ہے! ہم چیلنج دیتے ہیں کہ ان حضرات میں سے کوئی صاحب آگے بڑھیں اور اپنے اس دعوے کے اثبات میں قرآنِ کریم کی کوئی ایک آیت پیش کریں۔

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ یونہی کہہ دینا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ سوائے فریب دہی کے اور کیا ہے! معلوم ان لوگوں نے دین کو سمجھ کیا رکھا ہے کہ جس کے جی میں جو کچھ آئے۔ کہتا چلا جائے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں! اس میں شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں کے پاس کوئی ایسی قوت موجود نہیں۔ جس کی بنا پر وہ اِن لوگوں کو مجبور کر سکیں کہ یہ اپنے دعوے کو قرآنی دلائل سے ثابت کریں۔ لیکن انہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیئے کہ آخر ایک دن خدا کے سامنے پیش ہونا ہے وہاں کیا جواب بن پڑے گا! اللہ اکبر! انسان بھی کس قدر ظلوماً جھولا (ظالم و جاہل) واقع ہوا ہے۔ اگر ان لوگوں کا دعوے صحیح مان لیا جائے تو پھر قرآن کی رو سے (معاذ اللہ) اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہوگی کہ مسلمان ریت کے ذرّوں کی طرح بکھرا پڑا رہے کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے اپنے ساتھ اڑا کر، دریا کی ہر تیز رو اپنے ساتھ بہا کر لیجائے۔ ان ذرات کا سمٹ کر ایک چٹان بن جانا کہ جو مخالف قوت اس سے ٹھکرائے پاش پاش ہو جائے۔ خلافِ اسلام ہوگا۔ اِن کا اسلام انہیں یہ سکھاتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں ذلت و خواری نکبت و زبوں حالی۔ بے کسی و بے بسی۔ غربت و افلاس کی زندگی بسر کر کے گونڈ اور بھیل بن کر رہ جائیں۔ یہ تو گویا عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ لیکن اگر انہیں سرفرازی و سربلندی۔ عزّت و وقار۔ شوکت و سطوت۔ عظمت و حکومت کی زندگی مل سکے تو یہ سب کچھ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ غیر مسلم اکثریت کے ماتحت دن بسر کر کے شودروں کی زندگی بسر کریں یہ تو ان حضرات کے نزدیک عین مقصودِ اسلام ہے۔ لیکن ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک ذی عزّت قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا یکسر غیر اسلامی زندگی ہے! اللہ اکبر۔ یہ ہے

ان لوگوں کا قرآن ۔ اور یہ ہے اس قرآن کی تعلیم جو قرآن کریم چودہ سو برس سے مسلمانوں کے ہاں چلا آتا ہے ۔ ان لوگوں کے نزدیک (نعوذباللہ) ناقص ہے کہ وہ مسلمانوں کو عزت کی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے ۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اقبالؒ

اسکیم زیر نظر میں ابھی یہ شق کہیں لازم نہیں رکھی گئی کہ ملک کے جن حصوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ۔ وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر (کہ جہاں انہیں غیروں کی محکومیت میں زندگی بسر کرنا پڑے) اسلامی خطۂ ملک میں آجائیں لیکن اگر ان معترضین کے سامنے وہ قرآن ہوتا جو نبی صلعم پر نازل ہوا تھا تو اس میں تو یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی وقت ایسا آجائے کہ تمہارے دین اور وطن میں آویزش ہو جائے ۔ مسلمان اللہ کی حکومت میں زندگی بسر کرنے کے بجائے طاغوتی قوتوں کے نرغہ میں گھر جائیں اور اس نرغہ سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اس وقت بجائے اس کے کہ وہ اس غیر اسلامی زندگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں ۔ ان پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں وہ اپنا سر خدا کے سوائے کسی اور کے سامنے جھکانے پر مجبور نہ کئے جائیں جہاں قانون صرف خدا کا ہو انسانوں کا نہ ہو ۔ فرمایا ۔
یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿العنکبوت﴾

اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو ۔ میری زمین تو بڑی وسیع ہے ۔ پس (وہاں رہو کہ جہاں صرف میری ہی محکومیت ہو (کسی انسان کی حکومت نہ ہو)

یہی وہ اصولِ حقہ تھا جس کے ماتحت جناب نبی اکرم صلعم نے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ادھر ادھر کے تمام منتشر مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے پہلے اس ایک نقطہ پر حکومت خداوندی کی بنیاد رکھی یہیں بیٹھ کر مسلمانوں نے اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کیا ۔ اور اس کے بعد اللہ کی نصرت کو اپنے جلو میں لئے ہوئے اس زور و قوت کے ساتھ پھیلے کہ روئے زمین کا گوشہ گوشہ ان کے قدموں کے نیچے آگیا ۔ ان مسلمانوں کی پہلی اور دوسری زندگی کا موازنہ فرماتے ہوئے ان سے کہا گیا ۔ کہ

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴿۸﴾

ذرا اس وقت کو یاد کرو کہ تم اقلیت میں تھے۔ ملک میں ناتواں اور کمزور شمار کئے جاتے تھے (ہر وقت) اس خطرہ میں رہتے تھے کہ دشمن تمہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لیجائیں سو اس حالت میں اللہ نے تمہاری حفاظت کی اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت دی اور تمہیں رزقِ طیب عطا فرمایا۔ تاکہ سپاس گزار بنو۔ اور یہ حفاظت و نصرت اس شکل میں آئی تھی کہ مسلمانوں نے ایک خاص خطۂ ارض میں جمع ہو کر اپنی قوتوں کو مرکوز کیا اور وہاں سے پھر قوت و شوکت کے ساتھ چاروں طرف بڑھے۔ مسلمانوں کی منتشر قوتوں کا ایک خاص گوشہ میں جمع ہونے کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ اس وقت منافقین کے دعوئے اسلام کے اثبات کی دلیل ہی یہ قرار دی گئی تھی کہ یہ مسلمانوں کے اس مرکز کی طرف آتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں سے کہا گیا کہ دیکھنا! وہ منافق جو اسلام کی شوکت و عظمت کے حصول کی خاطر تمہارے اس طریق پر عمل پیرا نہیں ہو رہے۔ وہ تمہاری دوستی کے قابل نہیں ہیں۔

فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴿۸۹﴾ انہیں ہرگز اپنا دوست نہ بناؤ تاوقتیکہ اللہ کے راستہ میں ہجرت نہ کریں۔

چند آیات کے بعد ارشاد ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے ایسے وقت میں مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسلامی مرکز کے بجائے غیر اسلامی علاقوں میں زندگی بسر کرنے پر قانع ہو گئے۔ اور باز پرس کے وقت یہ عذر بار دیش کر دیا۔ کہ

كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ط (ہم کمزور اور ناتواں تھے) "اگر غیر مسلموں کی محکومیت میں زندگی بسر نہ کرتے تو کیا کرتے، ہم میں قوت کہاں تھی کہ اپنی حکومت قائم کر سکتے تو ان سے کہا جائیگا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾ کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی۔ کہ تم اس میں ہجرت کر کے اس مقام کی طرف

چلے جاتے جہاں اللہ کی حکومت تھی) یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور بہت بری جگہ ہے رہنے کی۔ حیاتِ اُخروی کا جہنم تو بعد میں آئے گا۔ اس دنیا میں غیر اللہ کی حکومت میں زندگی بسر کرنا اگر جہنم نہیں تو اور کیا ہے۔

زدوزخ واعظے کافر گرے گفت ـ حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
ندانداں غلام احوالِ خود را ـ کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

اور منافقین تو ایک طرف وہ مسلمان جنہوں نے ضعفِ ایمان کی بنا پر ہجرت کرنے میں تامل کیا۔ ان کے متعلق دوسرے مسلمانوں کو فرمایا۔ کہ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا

اور وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر انہوں نے ہجرت نہ کی۔ (اے مسلمانوں) تمہاری دوستی اور پشت پناہی میں ان کا کوئی حصہ نہیں تاوقتیکہ وہ ہجرت کرکے تمہارے ساتھ نہ آملیں۔ اور قرآنِ کریم کی رُو سے مومن حقاً۔ سچے مومن کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا ---------- رِزْقٌ كَرِیْمٌ

اور وہ لوگ جو ایمان لائے انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور مدد کی ان کو بخشش ہے اور روزی عزت کی۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے کسی گوشۂ ارض میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام وبقا کے لئے اگر گھر بار سب کچھ چھوڑ کر ہجرت بھی کرنا پڑے تو یہ جزءِ عین فریضۂ خداوندی اور جزوِ ایمان بلکہ شرطِ ایمان ہو جاتی ہے۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ ابھی ہجرت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ صرف اپنے اس علاقہ میں جہاں مسلمان اکثریت میں بستے ہیں۔ اسلامی حکومت کے قیام کی تجویز ہے اور ہمارے یہ جدید "مفسرین کرام" اور مجددینِ ملّت ہیں کہ اس کو بھی اسلام کے منافی اور قرآن کے خلاف بتا رہے ہیں محض اس لئے کہ ہندو اس اسکیم کو پسند نہیں کرتے۔

شیخِ ملّت با حدیث دلنشیں
(اقبالؒ)
بر مراد او کند تجدیدِ دیں

دوسرا اعتراض

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر مسلمان اس طرح ایک گوشۂ ارض میں سمٹ کر بیٹھ گئے تو اسلام کی اشاعت رک جائیگی۔ اور یوں یہ اہم فریضۂ خداوندی ساقط ہو جائے گا۔ ان معترضین کے نظریہ کے مطابق گویا صورت یوں قائم ہو گی کہ جب مسلمان شمال مغربی حصۂ ملک میں الگ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو پھر ان کے چاروں طرف بڑی بڑی خندقیں کھود کر انہیں آگ سے بھر دیا جائے گا۔ اور یہ حکم دیدیا جائے گا کہ جو شخص اس دائرہ آتشیں سے باہر جانے کی کوشش کرے گا۔ داخل جہنم کر دیا جائے گا! ہم اس اعتراض کھلا پن کے متعلق بجائے اسکے اور کیا کہیں کہ اگر یہ کھلی ہوئی فریب دہی نہیں تو چھپی ہوئی خود فریبی ضرور ہے۔ انگریز دنیا کے ایک کونے میں۔ ایک چپہ بھر جزیرہ کو اپنا مرکز بنائے۔ ساری دنیا میں تہذیب و معاشرت کی "تبلیغ" کر رہا ہے اور اس کی یہ "تبلیغ" قلوب و اذہان پر اس درجہ مسلط ہو رہی ہے کہ لوگوں کے نہ کان اپنے رہے ہیں نہ آنکھیں نہ دل اپنے رہے نہ دماغ۔ وہ سنتے ہیں تو ان کے کانوں سے دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے سوچتے ہیں تو ان کے دل سے سمجھتے ہیں تو ان کے دماغ سے یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے! صرف اس عظمت و جلال کے زور پر جو اس قوم نے حاصل کر رکھا ہے۔ اور یہ صرف انہی علاقوں میں نہیں جہاں انگریز کی حکومت ہے۔ بلکہ جو علاقے خود مختار ہیں۔ وہاں بھی یہ حالت ہے کہ لوگ فرنگی تمدن کو از خود مستعار لئے جا رہے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ اس تمدن کی حامل قوم کی برتری اور فوقیت کا تصور لوگوں کے دلوں میں غیر محسوس طور پر جاگزیں ہو چکا ہے اب آپ خیال فرمایئے کہ اگر مسلمان ایک گوشۂ ارض میں بیٹھکر شوکت و عظمت کی زندگی حاصل کر لیں تو کہیئے اس کے بعد وہ کونسی "سد سکندری" ہو گی جو ان سے عبور نہ کی جائے گی۔ وہ کونسی خندقیں ہوں گی جو ان کے راستہ میں حائل ہوں گی کہ وہ باہر جا کر اشاعتِ اسلام نہ کر سکیں گے ذرا اشاعت اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ دنیا کے اس قدر دور دراز گوشوں میں شمع خداوندی کی نورانی کرنیں پہنچیں کس طرح! ذرا سے غور کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جب مسلمانوں کا ایک مرکز مضبوط ہوا تو اس سر چشمہ سے مختلف سوتیں پھوٹیں اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں جوئے رواں بن کر پھیل گئیں۔ زندہ اور آزاد قوم کا کوئی فرد جہاں جائے گا۔ عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور اگر

وہ ایسے تمدن کا حامل ہو جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہ مل سکے - اور خود اس تمدن کا ایک پیکر تمثیلی بھی ہو۔ تو پھر تو پوچھیئے نہیں کہ وہ کس قدر گہرا اثر دلوں پر چھوڑ جاتا ہے - اسلام کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ اس قسم کے زندہ اور آزاد افراد تھے علیہ الرحمۃ خود آزاد ہوئے سرفراز ہو گئے اور اس کے بعد دنیا میں جہاں گئے - دنیا نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا - اور جو ان کے حلقۂ اثر میں آ گیا - پھر نکل کر نہ جا سکا لیکن جس کے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہ ہو جو خود ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ دنیا کے سامنے کیسا ہی شاندار پیغام کیوں نہ پیش کرے - دنیا حقارت کی ہنسی سے اس کا استقبال کریگی - آپ اتنے عرصہ سے انگلستان اور جرمنی میں اسلامی مبلغ بھیج رہے ہیں - وہاں مساجد تعمیر ہو رہی ہیں تبلیغی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں! کہیئے کہ اس کا کوئی جاذب نگاہ نتیجہ بھی سامنے آیا! یہ کیوں! کیا (نعوذ باللہ) آپ کا پیغام - فرنگی تمدن و معاشرت کے مقابلہ میں کمزور اور ناقص تھا؟ یہ وجہ تو نہ تھی! وجہ یہی تھی کہ غلام جہاں جائے گا - نفرت و حقارت سے دیکھا جائے گا - اس سے سب سے پہلا سوال یہی کیا جائے گا کہ اگر تیرے پاس یہ آب حیات موجود ہے تو خود اپنے اندر زندگی کی رمق پیدا کیوں نہیں کرتا! اگر یہ نسخۂ کیمیا تیرے قبضہ میں ہے تو دوسروں کے دروازہ پر گداگری کے لئے جھولی کیوں پھیلاتا ہے! دنیا میں اگر اسلام آج اس عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جس کا یہ مستحق ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اسلام کو پیش کرنے والے ہم ہیں جو غلامی کے ٹکڑوں پر گذارہ کر رہے ہیں آپ غیر مسلموں میں اسلام کا ذکر فرماتے ہیں اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اگر چندے اور یہی حالت رہی تو نہ معلوم بھوک اور افلاس سے تنگ آکر کتنے مسلمان دوسروں کے آغوش میں چلے جائیں گے - اور آپ کو کیا معلوم کہ پست درجہ کے افلاس زدہ قبائل میں یہ عملی ارتداد کس سرعت لیکن خاموشی کے ساتھ جاری و ساری ہے - ہم پوچھتے یہ ہیں کہ موجودہ صورت تشتت و انتشار میں - جسے آپ اسلامی زندگی بتا رہے ہیں - مسلمانوں میں وہ کونسی جذب و کشش باقی ہے - جس کی وجہ سے غیر مسلم کھنچ کر ان کی طرف آ جائیں ہندوستان کے کروڑہا اچھوت ہندو اتم جاتی کے پنجۂ استبداد سے تنگ آکر بار بار اس امر کا ارادہ کر چکے ہیں۔ کہ وہ کوئی ایسا مذہب اختیار کر لیں جو ان سے اخوت و مساوات کا سلوک کرے اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام

کے سوا کون سا مذہب ہے جو ان کے ان داعیات کو پورا کر سکتا ہے وہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کے سوا کہیں اور جائے پناہ نہیں ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان خود بھوکوں مر رہے ہیں۔ غربت و افلاس سے ان پر زمین تنگ ہو رہی ہے۔ تو وہ پھر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اگر آپ کی قوم میں شوکت و سطوت۔ عظمت و حکومت ہوتی تو پھر دیکھئے کہ یدخلون فی دین اللہ افواجا کا سماں کیسے جنت نگاہ بنتا۔ اگر آج ملک کے ایک حصہ میں بھی اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ جور و استبداد کے ستائے ہوئے۔ یہ ہر دروازے سے دھتکارے ہوئے حقوق انسانیت سے محروم رکھے ہوئے انسان کس طرح پروانہ وار شمع اسلام کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اگر جرأت عرض معاف کی جائے تو ہم اس مقام پر ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ سر سکندر حیات خاں صاحب فرماتے ہیں کہ موجودہ شکل میں اسلام کی اشاعت زیادہ ہو سکتی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ سر سکندر حیات خاں صاحب خیر سے حکومت پنجاب کے بلند ترین منصب پر فائز المرام ہیں انہیں مذہبی آزادی بھی حاصل ہے۔ دولت بھی ان کے پاس ہے اور قوت بھی۔ ذرائع بھی بہت وسیع ہیں اور وسائل بھی۔ ان تمام امور کے باوجود وہ ذرا ارشاد تو فرمائیں کہ انہوں نے آج تک کتنے ہندوؤں کو مسلمان کیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ یہ گہری تفکر طلب باتیں ہیں۔ جب ایک "اسلامی صوبہ" کے وزیر اعظم کی یہ حالت ہو تو یہ کہنا کہ موجودہ حالت میں اسلام کی اشاعت زیادہ زور سے ہو رہی ہے حقائق سے چشم پوشی نہیں تو اور کیا ہے! پھر یہ چیز بجائے خود غور طلب ہے کہ جس اسلام کو آپ آج اسلام کہہ رہے ہیں وہ اسلام کی نگاہ میں اسلام ہے بھی! کیا دنیا میں محکوم کا بھی کوئی مذہب ہوا کرتا ہے؟ اور کیا اسلام ایسے ہی مسلمان پیدا کرنا چاہتا ہے جو خود بھی غلام ہوں اور جو ان کی طرف آئے اسے بھی اپنے جیسا غلام بنا لیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے، یقین مانئے کہ آزاد مسلمان تو اگر نو بھی ہوں تو نو کروڑ غلاموں کے مقابلہ میں اسلام کے لئے زیادہ گراں قدر متاع ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس بات کو آج کل سمجھایا کیسے جائے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

اور پھر آپ نے اس چیز کو بھی سوچ لیا ہے کہ ہندوؤں کے منصوبے کیا ہیں! ڈاکٹر مونجے نے ابھی اگلے دنوں

اعلان کیا ہے۔ کہ ہندو مسلم مناقشات کے حل کا راز اسی میں ہے کہ مذاہب کی تبدیلی قانوناً ناجائز قرار دیدی جائے۔ یہ تو ہیں بے نقاب ہندو لیکن اس کے ساتھ اگر انہیں بھی دیکھ لیا جائے۔ جو "ہمہ اوستائیت" کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں تو ان کے ارادے اور بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ واردھا کی تعلیمی اسکیم۔ جو ایک مسلمان کے ہاتھ سے مرتب کرائی گئی ہے اور یہ جدید تفسیر قرآن جو مولانا آزاد کے "برہمو سماجی اسلام" کی بنیاد ہے۔ اگر اشاعت اسلام کو روکنے کی تدابیر نہیں تو اور کیا ہیں! یہ تعلیم کہ "عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اسلام کو کسی اور مذہب پر کوئی فوقیت اور برتری حاصل نہیں"۔ اسلام میں کونسی جذب و کشش باقی رکھ سکتی ہے جو آپ غیر مسلموں کو اسلام کے حلقۂ آغوش میں لے آئیں گے۔ اور پھر آپ کے نوجوانوں کے دلوں میں اس تعلیم کا راسخ کر دینا کہ نظامِ زندگی اخلاق کی بنیادوں پر نہیں بلکہ اقتصادیات کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے۔ ان کے اندر مذہب کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تمام تحریکیں اسی منظم پروگرام کے ماتحت بروئے کار لائی جا رہی ہیں کہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ اس سے باغی ہو کر آئیں۔ اور یہ اس وقت ہو رہا ہے جب ابھی زمامِ اقتدار پورے طور پر ہندو کے ہاتھ میں نہیں آئی۔ جب تمام و کمال اختیارات ہندو اکثریت کے ہاتھ میں آ جائیں گے۔ اس وقت دیکھیئگا کہ آپ کو اشاعت اسلام کے کس قدر مواقع دیئے جاتے ہیں۔

پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر ایک خطۂ زمین میں اسلامی حکومت اشاعت اسلام کے منافی ہوتی تو جب نبی اکرمؐ نے منتشر مسلمانوں کی قوتوں کو مدینہ منورہ میں مرکوز کیا ہے۔ اور دوسرے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا گیا کہ وہ ہجرت کر کے وہیں آ جائیں۔ تو اس وقت وہ مسلمان بھی یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر ہم سب ایک مقام پر سمٹ کر جمع ہو گئے تو اشاعت اسلام کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے یہ اعتراض بالکل نہیں کیا اس لئے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک طاقتور مرکز کے بغیر صحیح اسلام کی اشاعت کا تصور سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ جب مرکز مضبوط ہو گیا تو پھر وہاں سے مبلغ بھی نکلے۔ دعاۃ بھی مختلف مقامات میں پھیلے۔ سفیر بھی مختلف سلطنتوں میں پہنچے اور پھر ان مختلف چشموں

سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ سیراب ہوگیا۔ یہ ہے اشاعتِ اسلام کی صحیح صورت۔

اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ سردست مسلمانوں کا سمٹ کر ایک گوشہ میں مرتکز ہوجانے کا تو سوال ہی کہیں نہیں۔ ابھی تو صرف اتنی تجویز ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ان علاقوں میں اکثریت کی حکومت قائم کرلی جائے۔ اس میں سمٹنے اور گوشوں میں محصور رہ جانے کا سوال کہاں سے آگیا۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ اس قدر فہم و بصیرت کے مدعی بنتے ہیں اور باتیں ایسی طفلانہ کرتے ہیں۔

تیسرا اعتراض

پھر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس اسکیم کی رُو سے ہندوستان کے ان مسلمانوں کو جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں رہتے ہیں۔ کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے!

غور فرمایئے کہ یہ اعتراض ہندو دماغوں کی کتنی زبردست شاطرانہ عیاری کا آئینہ دار ہے۔

گویا اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو یہ کہکر بھڑکانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ دیکھو! یہ مسلم لیگ جس کی کامیابی اور کامرانی تمہاری قربانیوں کی بدولت ہے۔ اس کی روش یہ ہے کہ تمہیں بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں چھوڑ دیا اور اکثریت کے صوبوں میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس پروپیگنڈا کا لازمی نتیجہ تھا کہ سادہ لوح مسلمان واقعی اس دامِ فریب میں الجھ جاتا۔ لیکن الحمداللہ کہ مسلمان میں اب اتنی بصیرت پیدا ہوتی جارہی ہے کہ وہ دوست اور دشمن میں تمیز کرسکے۔ ذرا اس اعتراض کا حالات کی روشنی میں تجزیہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی کہیں پانچ ہے۔ کہیں سات کہیں دس ہے کہیں چودہ۔ ان پہ اگر بڑا کرم ہوا تو آبادی کے تناسب سے دو چار نشستیں زیادہ مل گئیں۔ لیکن سوچئے کہ اس سے فرق کیا پڑا۔ حکومت کا انداز جمہوریت ہوگا۔ فیصلے اکثریت کی آراء سے ہوں گے۔ اقلیت دس کی ہوئی تو کیا اور تیس کی ہوئی تو کیا۔ وہ تو اقلیت ہی رہے گی۔ دس ہیں تو ایک طرف اقلیت تو ۴۹ کی بھی ہو تو بھی اقلیت ہی رہتی ہے۔ اس لئے دو چار نشستوں کی کمی بیشی سے اُن کی حالت پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ صورت ہوگی الگ الگ صوبوں میں، اور مرکز میں یہ حالت ہوگی کہ تمام کہ ہندوستان کے مسلمان

مل کر کل آبادی کا قریب ایک چوتھائی ہوں گے - لہٰذا وہاں بھی یہ اقلیت میں رہیں گے - اور وہاں بھی فیصلے ہندو اکثریت کی رائے کے مطابق ہوں گے -

اب لیگ کی اسکیم کو لیجئے - اس کی رُو سے ان صوبوں کا جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں - ایک الگ مرکز ہوگا - اور ان صوبوں کا جہاں ہندو اکثریت میں ہیں جداگانہ مرکز ہوگا - ہندو اکثریت کے مرکز میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے - ایسے ہی اقلیت میں جیسے آج ہیں (یا جیسے تمام ہندوستان میں ایک مرکز ہونے کی صورت میں اقلیت میں ہوں گے) لیکن اس کے برعکس مسلمان اکثریت کے صوبوں کے مرکز میں ان کی اکثریت ہوگی - اور وہاں کے فیصلے مسلمان اکثریت کی رائے کے تابع ہوں گے - لہٰذا صورت حالات یوں ہوئی کہ

(۱) ہندو نظامِ حکومت کی رُو سے

(ا) اقلیت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت میں رہیں گے -

(ب) مرکز میں بھی مسلمان اقلیت میں رہیں گے

(۲) مسلم لیگ کی اسکیم رُو سے

(ا) اقلیت والے صوبوں میں مسلمان اقلیت میں رہیں گے اور

(ب) اپنے مرکز میں یہ اکثریت میں ہوں گے -

اب خود ہی فیصلہ فرمالیجئے کہ اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی اسکیم کے خلاف کیا شکایت ہوسکتی ہے - اگر یہ مسلمان اس اسکیم کی مخالفت کریں تو ان کا یہ طرزِ عمل کس قدر اسلام کی حمایت میں ہوگا! یوں سمجھیے کہ قیدخانہ کے کمرے میں دو قیدی ہوں - اور ایک ایسی تجویز درپیش ہو کہ جس سے ان میں سے ایک قیدی آزاد ہوسکتا ہو - اس وقت اگر دوسرا قیدی یہ کہہ کر اس تجویز کی مخالفت کرے کہ نہ بھائی! میں تو تمہیں آزاد نہیں ہونے دوں گا - تم چلے گئے تو میرا جی اداس ہو جاوے گا میں باتیں کس سے کروں گا - اس لئے بھیا - میں اس تجویز کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا - تو خیال فرمالیجئے کہ آپ اس رفیق کے جذبۂ رفاقت و ہمدردی کی کتنی داد دیں گے! اُسے تو

چاہیئے کہ اس تجویز کی پوری پوری قوت کے ساتھ تائید کریں کہ دو قیدیوں کے مقابلہ میں ایک قیدی اور ایک آزاد تو بہرحال اچھا ہے۔ یہ آزاد باہر نکل کر پھر اپنے دوسرے بھائی کی آزادی کے لئے بھی کوشش کر سکتا ہے! اس لئے اقلیت کے صوبہ کے مسلمانوں نے فی الواقعہ بڑی دانش، اطواری و جذبۂ اخوتِ اسلامی کا ثبوت دیا جب انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس میں اس ریزولیشن کی بلاشرط تائید کی۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے ایسی ہی امید رکھنی چاہیئے

یہ تو ہے تصویر کا ایک رُخ۔ اب دوسری طرف آیئے۔ اس وقت تمام ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اکثریت کی طرف سے ان پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ ان کی مدافعت کا کوئی سامان ان کے پاس موجود نہیں۔ اگر ملک میں دو الگ الگ مراکز ہوں تو جہاں ہندو اکثریت کے مرکز میں مسلم اقلیتیں آباد ہوں گی وہاں مسلمان اکثریت کے مرکز میں ہندو اقلیتیں ہوں گی۔ اس لئے اس وقت ہندو اپنی مسلم اقلیت پر دراز دستی کرتے وقت سو مرتبہ سوچے گا کہ اسے معلوم ہوگا کہ

میرے نشتر کی زد شریانِ قیس ناتواں تک ہے

آج جو کچھ ہندو کر رہا ہے اسے ذرا غور سے دیکھئے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس کا بنیا پن کس قدر کرشمہ زا ہے۔ اُتم جاتی کا ہندو (CASTE Hindu) بڑی تھوڑی تعداد میں ہے۔ اس نے نیچ ذاتوں کے اقوام (اچھوت) کو ہندو بنا کر اپنی تعداد ۲۳ کروڑ تک پہنچائی ہے اور اس تعداد کی حیثیت سے تمام حقوق و مراعات حاصل کر رکھے ہیں لیکن ان حقوق و مراعات میں اچھوت بیچارے ایک پائی کے بھی شریک نہیں۔ یعنی اچھوتوں کے صدقہ میں اکثریت حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کو اس میں سے حقوقِ انسانیت بھی نہیں دیتے۔ یہ ہے ان کا قومی بنیا پن»۔ اب ان کا ملکی "بنیا پن" ملاحظہ ہو یہ تمام ہندوستان کو ایک ملک اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے کر حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن مسلمان کو اقلیت شمار کر کے حکومت پھر اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اگر آج اچھوت اپنے آپ کو الگ قوم شمار کر لیں۔ تو ہندو مٹھی بھر اقلیت رہ جائے اور اگر مسلمان آج اپنی جداگانہ قومیت کا دعوےٰ منوا کر اپنی اکثریت کے علاقہ میں اپنی حکومت قائم کر لے تو ہندوؤں کے رام راج کے منصوبے خواب پریشاں بن کر

رہ جائیں۔ ہندو اپنی پوری قوت اس باب میں صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو مشتعل کرکے اس تجویز کی مخالفت کرا دے تاکہ اپنی خانہ ساز اکثریت کا طلسم نہ ٹوٹنے پائے۔

اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا جاتا ہے کہ تم سے تمہارا وطن چھڑایا جائے گا۔ تمہیں ہجرت کرکے مسلم اکثریت کے صوبوں میں جانا پڑے گا۔ اور اس میں بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ سو اول تو سرے درست لیگ کی اسکیم میں تبادلۂ آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں کہ بس ترک وطن سے مسلمان کو ڈرایا جاتا ہے۔ سوچئے تو سہی کہ وہ ترک وطن ہے کیا چیز!

باب اول میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک اصولِ فطرت کے مطابق زندگی وہاں بسر ہوتی ہے۔ جہاں نظامِ زندگی قوانین الٰہیہ کے مطابق متعین ہو۔ اس کے علاوہ ہر مقام پر زندگی غیر فطری ہے۔ اب ایک مثال کے ذریعے یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ ترکِ وطن کیا ہے! کسی جنگل میں ایک گھنے رہتی ہو۔ ادھر ادھر سبز سبز گھاس گھنے درختوں کا سایہ۔ ماحول سے مانوس گرد وپیش سے مالوف۔ یہ اس کا وطن ہے۔ اس وطن میں وہ خوش ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا آ گیا کہ وہاں پانی خشک ہوگیا۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ کہیں آس پاس پانی مل جائے۔ لیکن ناکام رہی۔ اب اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ پانی کی تلاش میں نکلے۔ اور جہاں پانی ملے۔ وہیں زندگی بسر کرے۔ یہ ہے اس کا ترکِ وطن جو عین تقاضائے فطرت کے مطابق ہے۔ اب اگر اس ہجرت کے وقت گرد وپیش کے سنگ ریزے جمع ہوکر اسے سمجھائیں کہ تم یہ کیا کر رہی ہو! ایک عمر یہیں گذاری۔ یہاں کے ذرہ ذرہ سے تمہیں انس تھا۔ اپنا گھر بنا کر بیٹھی تھیں۔ ہم تمہارے ساتھی دل بہلانے کو موجود تھے۔ تم نہ جاؤ۔ کیا تمہیں اپنے گھر سے محبت نہیں؟ اس کے جواب میں جو کچھ وہ گائے کہے گی ظاہر ہے۔ وہ کہے گی کہ بھائی! یہ سب کچھ درست لیکن مشکل یہ ہے کہ تم میرے ادعائے فطرت سے واقف نہیں ہو۔ اب یہاں کی زندگی میرے لئے غیر فطری ہے۔ میری پیاس کا تقاضا ہے کہ میں پانی کے مقام پر پہنچوں یہ ماحول اسی وقت تک میرا وطن تھا جب تک میرے تقاضائے فطرت کو پورا کر رہا تھا میں نے اسے وطن بنایا ہی اس لئے تھا۔ اب اگر یہ سرزمین میری فطرت سے سازگار نہیں رہی اور اسے

سازگار بنانا میرے بس میں نہیں۔ تو میرے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں کہ میں اس مقام کو اپنا وطن بناؤں جو میرے تقاضائے فطرت کو پورا کرے کہ اِنَّ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃ۔ اب یہاں رہنا میرے لئے خودکشی کے مرادف ہے جو ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اس وقت اگر اس ماحول اور ماحول کا انس دامنگیر ہو گیا تو میں نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ اس لئے اب میرا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے۔ جب یہاں پانی کی افراط ہوگی۔ پھر آ جاؤں گی۔ کہ اصل شے یہ خاک کے ذرے۔ یہ فضا کی ہوا۔ یہ درختوں کے سائے۔ یہ خوشنما منظر نہیں بلکہ اصل شے پانی ہے کہ اس پر میری زندگی موقوف ہے۔ جہاں وہ ہے۔ وہ صحرا بھی گلشن۔ اور اگر وہ نہیں تو ایسی جنت بھی جہنم۔

اس مثال کو آگے بڑھائیے۔ یہ گھاس اور یہ پانی۔ مقتضیاتِ فطرت ہیں اور ان میں انسان اور حیوان دونو برابر کے شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بنا پر ترکِ وطن صرف اس گائے پر ہی موقوف نہیں۔ انسانوں کے خانہ بدوش قبائل عمر بھر یہی کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں انسان تو حیوانات سے ایک کڑی آگے ہے۔ اس اگلی کڑی اشرف انسانیت کے لئے بھی کچھ مقتضیاتِ فطرت ہیں یہ مقتضیات وہاں پورے ہو سکتے ہیں۔ جہاں حکومت الٰہیہ کا قیام ہو۔ اگر حالات ایسے ہیں کہ جس مقام پر کوئی مسلمان پیدا ہوا ہے۔ وہیں یہ سامان موجود ہیں جو اسکے تقاضائے فطرت کو پورا کرتے ہیں تو وہ خوش قسمت ہے کہ اسے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نہیں جانا پڑا۔ لیکن اگر صورت یہ نہیں ہے تو محض اس لئے اس مقام سے چپکے رہنا کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں۔ میرے بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں۔ ایک غیر فطرتی زندگی پر قناعت کر جانا ہے۔ یہ تھا وہ مقام جہاں اسے قرآن کریم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ مومن کا وطن وہی ہے جہاں یہ قوانین فطرت کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ اور یہی تھی وہ منزل جہاں اس کے ہادیٔ برحق جناب نبی اکرمؐ کے نقوشِ قدم کا ایک ایک ذرّہ اسے کہہ رہا تھا کہ حضورؐ نے اپنا وطن، مکہ بھی تقاضائے فطرت کے مطابق چھوڑا تھا۔ اب آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ ایک مسلم اور غیر مسلم کے نظریۂ وطنیت میں کیا فرق ہے اور ایک مسلمان کا وطن کے ساتھ حقیقی تعلق کیا ہوتا ہے

اور کس وقت وطن کی آب وگل کی پابندی اس کے لئے ہلاکت کا موجب بن جاتی ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کے مطابق۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

یہ ہے ایک مسلم کا صحیح نظریۂ وطنیت لیکن مشکل یہ ہے کہ غیر مسلم اس فرق کو سمجھ نہیں سکتا جس طرح وہ سنگ ریزے اس گائے کے اقتضائے فطرت کا احساس نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مدت کی غیر فطری زندگی سے خود ہماری فطرت بھی مسخ ہو چکی ہے۔ اور جس طرح صفرا کے مریض کو شہد بھی کڑوا معلوم ہوتا ہے ہمیں یہ ادعائے فطرت (یہ صحیح اسلامی زندگی) کچھ اجنبی سی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس غیر فطری زندگی کو ہی فطری قرار دیدیں۔ ہماری قوتِ ذائقہ بیشک مسخ ہو چکی ہے لیکن الحمد اللہ کہ قرآنی آبگینوں میں وہ عسلِ مصفی اسی طرح موجود ہے کہ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (وہ قلوب واذہان کی تمام بیماریوں کا علاج ہے)۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ جس وقت شمال مغربی خطہ ملک میں اسلامی حکومت کا قیام ہوگا (اور لیگ کی اسکیم اسی کا مقصد ہے) اس وقت اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے یہ ادعائے فطرت ہوگا کہ وہ اس جہنم کو چھوڑ کر جس میں ہر طرف طاغوتی قوتوں کا پنجۂ استبداد کار فرما ہے۔ اس جنتِ ارضی میں آجائیں جہاں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو۔ اور پکارنے والا پکار کر کہے کہ

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ یہ ہے وہ جنت (ارضی) جس کے تم اپنے اعمال کی بدولت وارث بنائے گئے ہیں۔

چوتھا اعتراض پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے اندازِ حکومت میں مرکز میں بہت کم اختیارات رہ جائیں گے۔ مختلف صوبے اپنے اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہوں گے۔ لہٰذا جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں انہیں وہاں ہر طرح کا کامل اختیار و اقتدار ہوگا پھر ایک نئے مرکز کی ضرورت کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تعداد کے لحاظ سے مرکز میں بہت کم شعبے ہوں گے۔ لیکن ذرا اس پر بھی غور فرمائیے کہ کیفیت کے اعتبار سے وہ شعبے کیسے ہوں گے۔ مثلاً دفاع (Defence) یعنی شعبۂ فوج مرکز کے زیرِ اختیار ہوگا۔ امورِ خارجہ ابیرونی سلطنتوں سے تعلقات مرکز کے متعلق ہوں گے فنانس مالیات، کی سب سے بڑی مد کسٹم (بحری چونگی) مرکز سے وابستہ ہوگی۔ سلسلۂ رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت بھی نگرانی مرکز کی ہوگی۔ خیال فرمایا آپ نے کہ اقتدار مرکز کی عمارت کیسے کیسے محکم ستونوں پر قائم ہوگی۔ یوں سمجھئے کہ کسی سے کہہ دیا جائے کہ تمہیں اپنے کان پر پورا اختیار ہے ناک تمہارے قبضہ میں ہے آنکھ کے معاملہ میں تم آزاد ہو۔ تمہارے ہاتھ پاؤں بھی کھلے ہیں ان سب معاملات میں تمہیں پوری آزادی ہے۔ البتہ تمہارے دل اور دماغ اور معدہ پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ ان سے جس طرح ہم چاہیں گے کام لیں گے تو فرمائیے کہ یہ آزادی کس قسم کی ہوگی پھر ہمارے "علما حضرات" کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ نہیں! ہم جدید نظامِ حکومت میں ایک ایسا شعبہ الگ قائم کرائیں گے جو تمدنی اور معاشرتی مسائل میں احکام نافذ کرے گا۔ اور اس میں کسی غیر مسلم کو دخل نہ ہوگا۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کو کیسے سمجھایا جائے کہ تمدن و معاشرت ہمیشہ حکومت کے سایہ میں پرورش پاتے ہیں۔ اور حکومت اسی کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں محکمۂ فوج۔ محکمۂ امورِ خارجہ اور محکمۂ مالیات ہوں۔ آج بھی مسلمانوں کے مقدمے "قانونِ محمدی" (Mahmaddan Law) کے ماتحت فیصل ہوتے ہیں۔ انگریز نے کبھی اپنا تمدن و معاشرت مسلمانوں پر بزور مسلط نہیں کیا۔ لیکن ان تمام "آزادیوں" کے باوجود کیسے

مذہب، تمدن، معاشرت کی جو حالت ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ مشکل اندر یہ کہ ہمارے مولوی صاحبان کے نزدیک مذہب، عبادات و مناسک اور چند رسوم و مظاہر کا نام ہے۔ آج اگر ان سے پوچھا جائے کہ جس چیز کو آپ انگریز کی غلامی کہتے ہیں وہ ہے کیا؟ کونسی بات ہے جس میں انگریز نے آپ کو غلام بنا رکھا ہے؟ تو اس کے جواب میں وہ ہندوؤں سے سنی سنائی صرف اتنی بات کہہ سکیں گے کہ انگریز اس ملک کی دولت کو لوٹ کرلے جا رہا ہے۔ ہندوستان کے باشندے فاقوں مر رہے ہیں۔ یہاں کسی کو کپڑا نصیب نہیں ہوتا! چنانچہ یہ حضرت اپنی ہر تقریر اور ہر بیان میں اسی غلامی کا رونا روتے ہیں اور اپنے مسلک کی تائید میں ہمیشہ یہی دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ جب انگریز یہاں سے نکل جائے گا تو پھر ملک میں خوشحالی اور فارغ البالی ہو جائے گی۔ یعنی ان کے نزدیک غلامی کے معنی بھوک اور افلاس کے ہیں اور آزادی سے مقصد روٹی کی فراغت ہے ورنہ "مذہب" نہ آج غلام ہے نہ اس کے بعد ہندوؤں کے عہد حکومت میں غلام رہے گا۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اگر ان حضرات کو معلوم ہوتا کہ "اسلام کی آزادی" کے کیا معنی ہیں تو وہ خود سمجھ جاتے کہ جس نظام حکومت میں دفاع (محکمۂ فوج) اور امور خارجیہ جیسے اہم شعبے غیر مسلموں کے اختیار و اقتدار میں ہوں۔ اور ایسے قوانین جن کا اطلاق ملک کے تمام باشندوں پر مشترکہ طور پر ہوا ہو ان کی توضیع و تنقید بھی غیر مسلم کی اکثریت پر مبنی ہو۔ اس نظام حکومت میں اسلام کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ اسلام۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا حکم دیتا ہے۔ (کہ حکومت خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی) وہ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا کا ارشاد نازل فرماتا ہے (کہ اللہ اپنے اس حق حکومت میں کسی اور کی شرکت جائز قرار نہیں دیتا) اس لئے وہی حکومت۔ حکومت خداوندی کہلا سکتی ہے جس کے کسی شعبہ میں وچہ جائیکہ ایسے اہم شعبوں میں) غیر مسلموں کی شرکت نہ ہو کر۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے۔ حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

پانچواں اعتراض

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہماری ہزارہا مساجد ہیں۔ علیحدگی کی اسکیم کے مطابق یہ تمام مساجد چھوڑنے پڑیں گے۔ یہ اعتراض بھی اسی مفروضہ کے ماتحت کیا جاتا ہے کہ اس علیحدگی کی اسکیم کی رو سے تمام ہندوستان کے کسی اور حصہ میں کوئی مسلمان نہیں رہے گا۔ حالانکہ جیسا کہ متعدد بار لکھا جا چکا ہے۔ اسکیم زیر نظر میں تبادلہ آبادی کی کوئی شرط نہیں۔ سردست جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔ اور اسی طرح مسلم اکثریت کے علاقوں میں اسلامی حکومت کے قیام کا آغاز ہو جائے گا لیکن اگر علیحدگی کی اسکیم کی انتہائی شکل کو بھی سامنے رکھ لیا جائے جس میں اقلیت کے صوبوں کے مسلمان بطیب خاطر اسلامی حکومت کی زندگی بسر کرنے کے لئے مسلم اکثریت کے صوبوں میں آنا چاہیں تو اس وقت بھی یہ اعتراض کوئی وقعت نہ رکھے گا۔ نبی اکرم صلعم نے جب ہجرت فرمائی ہے تو کعبہ جیسے مقدس معبد کو کفار کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس سے محبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر حضور کی نگاہ آرزو رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھی (قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ) لیکن یہ چھوڑ آنا دراصل حاصل کرنے کا مقدمہ اور یہ دو رہنے آنانی حقیقت قریب آجانے کی تمہید تھا۔ گئے اس لئے تھے کہ پھر آئیں۔ اور آئیں تو اس انداز سے کہ دس ہزار قدسیوں کی جماعت جلو میں ہو۔ اور فتح و ظفر آگے بڑھ بڑھ کر قدم چوم رہی ہو حقیقت یہ ہے کہ یہ معترض حضرات اس اصل کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ جب کوئی قوم صاحبِ حکومت ہوتی ہے تو اس کی ہر شے ہر مقام پر محفوظ ہوتی ہے۔ عیسائی مشنریوں کو دیکھئے۔ دنیا کے ان دور دراز مقامات میں جہاں ملک غیروں کا ہو حکومت دوسروں کی ہو۔ یہ لوگ تنہا جاتے ہیں اور اپنے گرجے تعمیر کرتے ہیں۔ چونکہ صاحبِ حکومت و اقتدار قوم کے افراد ہوتے ہیں کسی کی مجال نہیں جو ان کے معابد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اس کے برعکس ایک آپ ہیں کہ نو کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہیں لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کی مساجد دوسروں کے قبضے میں چلی جاتی ہیں اور آپ کچھ نہیں کر سکتے مساجد موجود ہیں لیکن ان میں اذان اور نماز کی اجازت نہیں ملتی۔ لیکن آپ ہیں کہ نہایت خاموشی سے سب کچھ دیکھنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے! اس لئے کہ آپکی قوتوں

کا ہر ایک کو اندازہ ہے۔ حکومت اپنی ہو تو دیکھئے کہ کونوں اور گوشوں میں پڑی ہوئی مساجد کی بھی حفاظت کس طرح ہو جاتی ہے۔ مساجد کا وقار تو باندازۂ وقارِ اہلِ مساجد ہے۔

تو قدرِ خویش ندانی۔ بہاز تو گیرد   اگرنہ لعل درخشندہ پارہ سنگ است

چھٹا اعتراض پھر کہا جاتا ہے کہ اقتصادیات کے نقطۂ نظر سے یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے۔ بلوچستان اور سندھ اپنا خرچ آپ پورا نہیں کر سکتے۔ اس لئے انہیں مرکزی حکومت سے امداد ملتی ہے۔ اگر یہ خطہ الگ ہو گیا تو انہیں امداد کہاں سے ملے گی۔ پنجاب میں استطاعت کہاں ہو گی جو ان کی کفالت بھی کر سکے۔ نیز حدود کی حفاظت کے سلسلے میں جو اخراجات آج مرکزی حکومت برداشت کر رہی ہے وہ بھی اسی خطہ کو اٹھانے پڑیں گے۔

یہ اعتراض اس مفروضہ پر کیا جاتا ہے کہ حکومت کی مشینری جس قدر (Costly) گراں آج ہے اس وقت بھی ایسی ہو گی۔ لیکن یہ حضرات اتنا نہیں سمجھتے کہ اپنی اور غیروں کی حکومت میں اتنا ہی تو فرق ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہو گی کہ یہ بڑے بڑے "سفید ہاتھی" اس وقت بھی علیٰ حالہٖ باندھ رکھے جائیں۔ یہ آٹھ۔ دس ہزار روپیہ ماہوار کے گورنر یہ تین چار ہزار روپیہ ماہوار کے وزیر اعظم یہ وزراء۔ یہ چیف سیکرٹریز۔ یہ اسپیکرز۔ یہ ممبرز۔ یہ سب کچھ موجودہ نظامِ حکومت کے کرشمے ہیں۔ جب حکومت اپنی ہو تو پھر ان اخراجات کی کیا ضرورت ہو گی؟ جب کانگریس نے صوبوں کی حکومتیں سنبھالی ہیں تو گاندھی جی نے انہیں نصیحت کی تھی کہ دیکھو تمہارے سامنے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی مثال موجود ہے کہ انہوں نے کس طرح شہنشاہی میں بھی اندازِ فقیری کو قائم رکھا تھا۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ کانگریسی وزراء نے کس حد تک اس نصیحت پر عمل کیا۔ لیکن ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے اسوۂ حکومت کے اندر غیر مسلم اپنے لئے سامانِ موعظت دیکھتے ہیں تو خود مسلمان اس اسوہ کی روشنی میں کیوں نہ چلیں۔ اور اگر مسلمان اس اندازِ حکومت کو اپنے لئے بطور نشانِ راہ قرار دے لیں تو پھر وہ کونسی اقتصادی مشکل ہے

جو حل نہ ہو سکے گی! یہ مشکلات جو آج مسلمان کو اس درجہ پریشان و متوحش کر رہی ہیں۔ بظاہر اقتصادی مشکلات ہیں لیکن بغور دیکھئے تو ان مصائب کا حقیقی سبب کچھ اور ہے یہ چیزیں تو علاماتِ مرض ہیں علتِ مرض نہیں ہیں۔ جب علتِ مرض کا علاج ہو جائے گا تو علاماتِ مرض خود بخود غائب ہو جائیں گی۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

باب چہارم

غیر مسلموں کے اعتراضات

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

سابقہ باب میں ہم نے جن چند موٹے موٹے اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔ وہ بالعموم مسلمانوں کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ——— کوئی اور بولتا ہے یہ میری زبان نہ سمجھو۔ لیکن کچھ اعتراضات ایسے بھی ہیں جو ہندوؤں کی طرف سے خود ان کی زبان سے عائد کئے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان اعتراضات کا بھی تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ ان کی حقیقت کیا ہے

پہلا اعتراض

اس باب میں سب سے پہلے مسٹر راجہ گوپال اچاریہ آگے بڑھے اور انہوں نے مختلف مقامات پر آہ و زاری کی کہ دیکھنا! یہ مسلمان کیا حرکت کر رہے ہیں؟ یہ تو بھارت ماتا کے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ اس اعتراض کی ابتدا گوپال اچاریہ صاحب کی طرف سے ہوئی اور پھر اس کی صدائے بازگشت ملک کے مختلف حصوں سے سنائی دی۔ چنانچہ اب ہر طرف

سے یہی آواز سنائی دیتی ہے کہ مسلمان بھارت ماتا کے حصے بخرے کر رہے ہیں اور اس چیر پھاڑ کا ماتم کچھ ایسے دردانگیز پیرایہ میں کیا جاتا ہے گویا بھارت ماتا سچ مچ کا ایک انسانی تپلا ہے کہ مسلمانوں کی سبعیت و بہیمیت جس کی قطع و برید کر دینا چاہتی ہے اور "خون ریزی" کا یہ منظر اس ماتا کے سپوتوں کو لہو رلا رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ "بھارت ماتا" ہے کیا چیز! یہ ظاہر ہے کہ انگریزوں نے یہاں پہنچ کر کچھ علاقہ فتح کیا (یونہی کہئے کہ فتح کیا۔ اور کیا کہا جائے) اور اس مفتوحہ علاقہ کی حدود بندی کر کے اسے ایک ملک قرار دے دیا۔ اس ملک کا نام "بھارت ماتا" ہے یعنی یہ ایک اتفاقی امر تھا۔ (یا انگریز کی مصلحت کوشی) کہ انگریز درہ خیبر تک کا علاقہ فتح کر سکے۔ اس لئے بھارت ماتا وہاں تک پھیل گئی اگر وہ دس میل ادھر رہ جاتے تو ماتا جی بھی سکڑ جاتیں اور وہ اگر دس میل اور آگے بڑھ جاتے تو یہ بھی ساتھ ہی پھیل جاتیں یعنی بھارت ماتا کا قد و قامت جسم اور جثہ اس حدود اربعہ کا نام ہے جہاں تک انگریز بڑھا ہے۔ اب فرمائیے جس بھارت ماتا کا وجود اس انداز سے عمل میں آیا ہو۔ اس کے متعلق یہ دہائی مچانا کہ اس میں کمی بیشی کرنا بڑی "اتیاچاری" ہے کس قدر ساحرانہ فریبی ہے۔ نیپال کو دیکھئے۔ ایک جنگلی جتنا علاقہ ہے۔ چونکہ انگریزوں نے اسے فتح نہیں کیا۔

اس لئے وہ بھارت ماتا نہیں بن سکا۔ حالانکہ ہر وقت بھارت ماتا کے سینے پر لٹک رہا ہے سیلون کو انگریزوں نے اپنی انتظامی مصلحتوں کی بنا پر الگ رکھا اس لئے بھارت ماتا بیچاری بغیر پاؤں کے ہی رہ گئی۔ کل تک برما بھارت ماتا کا جزو تھا۔ اسے الگ کر دیا گیا تو بھارت ماتا کا ایک بازو کٹ جانے پر بھی کچھ نہ بگڑا۔ کبھی آپ نے سوچا بھی کہ ہندوؤں نے برما کی علیحدگی پر کیوں اتنا واویلا نہیں مچایا، جتنا شمال مغربی علاقہ کی علیحدگی پر مچایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ برما میں ہندوؤں کی اکثریت ہے الگ ہونے پر بھی وہاں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ برعکس اس کے شمال مغربی علاقہ کی علیحدگی پر اس لئے سینہ کوبی ہو رہی ہے، کہ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اور ہندو یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ مسلمان بھی کسی خطہ ملک میں اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ ہندو تو اس بنا پر بھارت ماتا کے ٹکڑے ہو جانے پر مصروف آہ و بکا ہے۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں ان قومیت پرست مسلمانوں سے جو اس شین بشیوں میں ہندوؤں کے ہم نوا ہیں کہ اس تقسیم سے آپ کے دل میں کیا درد اٹھا ہے! محض اس لئے

کہ آپ نے بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اس ملک کو مادرِ وطن کہنا شروع کر دیا ہے! ذرا سوچئے تو سہی کہ اسلام کے دعوے کے ساتھ یہ مادرِ وطن کا نظریہ کیا معنی رکھتا ہے! قرآن تو حقیقی ماں باپ کے متعلق ارشاد فرماتا ہے کہ اگر وہ تمہارے خدا کے راستہ میں حائل ہو جائیں اور اس وقت ان کی کشش و محبت تمہارے دل کو ان کی طرف جھکا دے۔ تو تم مسلمان کہلانے کے مستحق ہی نہیں ہو۔ اور ایک آپ ہیں کہ خاک کے ذروں کو اپنی مادر بناتے ہو۔ اور پھر اس مادر کی محبت اس قدر تمہارے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے کہ اسے جزو ایمان قرار دے لیتے ہو! اواخر اپریل میں دہلی میں جو "آزاد" کانفرنس منعقد ہوئی ہے (جس کا تفصیلی ذکر کسی آئندہ باب میں آئے گا) اس کے پنڈال میں سٹیج کے سامنے بڑی نمایاں جگہ بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا کہ

حب الوطن من الایمان

اور بائیں جانب اتنے ہی بڑے حروف میں تحریر تھا کہ "حیا اور وطن کی محبت ایمان کی نشانیاں ہیں" اور ان "قطعات" کے سایہ میں بڑے بڑے جید علمائے کرام کانفرنس منعقد فرما رہے تھے! کیا کوئی صاحب ان میں سے کسی سے پوچھ کر ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آخر — "حب الوطن من الایمان" یہ ہے کیا؟ خدا نکردہ کوئی آیت قرآنی ہے کوئی حدیث رسول اللہ ہے۔ خلافتِ راشدہ کا موثہ ہے۔ یہ کیا چیز ہے جسے اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ کلام اللہ کو چھوڑ کر اقوالِ رسول اللہ کو (نعوذ باللہ) پس پشت ڈال کر اسے سب سے نمایاں جگہ آویزاں کیا جا رہا ہے۔ اور پھر "حیا اور وطن کی محبت ایمان کی نشانیاں ہیں" لکھ کر جس سادگی و پرکاری سے عوام کو دھوکا دینے کی ناکام کوشش کی گئی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ "حیا ایمان کی شاخوں میں سے ہے"! یہ ایک مشہور حدیث ہے۔ اس کے ساتھ وطن کا ٹکڑا شامل کر کے ان مولوی صاحبان نے جس تدلیس و تحریف کا مکروہ ثبوت دیا ہے۔ وہ ان کی مقدس قباؤں اور متبرک عباؤں کے نیچے چھپے ہوئے دل کی حقیقت کو بے نقاب کر رہی ہے۔ ہم ان اجارہ دارانِ دینِ حنیف سے باادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ "وطن کی محبت" کو ایمان کی نشانی اللہ نے قرار دیا ہے یا اللہ کے رسولؐ نے قرار دیا ہے۔ یا آخر یہ کس کا فیصلہ ہے کہ وطن کی محبت ایمان کی نشانی ہے۔ حیرت

ہے کہ بازی بازی باریش بابا ہم بازی۔ یہ حضرات اس حد تک بے باک ہو گئے ہیں کہ نہ انہیں خدا کا خوف ہے نہ عاقبت کا ڈر۔ دین کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور اس درجہ کھلا ہوا مذاق۔ وطن کی محبت کو ایمان کی نشانی بتاتے ہیں اور پھر اس یکسر غیر اسلامی نظریہ کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں گویا یہ خدا و رسول کا فرمان ہے!

زمن بر صوفی و مُلا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را

ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را (اقبالؒ)

ہاں تو یہ ہے حقیقت ہندو کی "بھارت ماتا" اور ان کے ذلہ چین مسلمان کی "مادر وطن" کی یعنی اس کا وجود طوق غلامی کے اس حلقہ پر مشتمل ہے جو اسے انگریز نے پہنایا۔ اور اب اسے ایسا مقدس بتایا جاتا ہے کہ اس کے حدود کا تعین گویا خود ایشور پرماتما نے کیا تھا جس میں کوئی انسان رد و بدل نہیں کر سکتا خودداری اور حمیت کا تو تقاضا یہ ہے کہ ان حدود و قیود کو جس قدر ممکن ہو توڑ کر رکھ دیا جائے کہ یہ حدود در اصل یادگار ہیں انگریز کے عہد حکومت کی جسے تم غلامی کا زمانہ کہتے ہو! لیکن جس کی رگ و پے میں خوئے غلامی پیوست ہو چکی ہو۔ وہ غلامی کی یادگار کو مٹائے گا کیوں! اسے مٹائے گا تو مسلمان ہی مٹائے گا جو فطرۃً آزاد ہے۔ اور غلامی جس کے ہاں مسخ شدہ فطرت کی نشانی ہے۔

گاندھی جی کے اعتراضات

اب ہم طوطی پس آئینہ یعنی ان معترضین کے استادِ ازلی جناب گاندھی جی کے اعتراضات کا تجزیہ کرکے دیکھتے ہیں کہ وہ کس درجہ وقیع ہیں۔ وہ حسب معمول۔ اس میدان میں بھی اپنی شان مہاتمائیت کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ چہرہ زرد۔ لب پہ آہ سرد۔ غم سے نڈھال۔ دونوں ہاتھ سے کلیجہ تھامے۔ افتاں خیزاں تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان ہم خیال حضرات۔ اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے۔ بلکہ

وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۹ ہم ء)

اللہ اکبر! مسلمانوں کا درد مہاتما جی کے قلب حزیں کو کس درجہ ستا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ اسلام کے دامنِ تقدیس پر کوئی دھبہ نہ آ جائے مسلمانوں کو کوئی سیدھے راستہ سے بھٹکا نہ دے۔ اللہ رے انداز غمنوازی ایسے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو۔

اس اثر و درد میں ڈوبی ہوئی تمہید کے بعد اعتراضات ملاحظہ فرمائیے۔ گاندھی جی علیحدگی کی اسکیم کے خلاف براہ راست اعتراض نہیں کرتے بلکہ وہ اس اصول کے خلاف اعتراض کرتے ہیں جس پہ علیحدگی کی اسکیم مبنی ہے۔ یعنی وہ کہتے یہ ہیں کہ یہ نظریہ سراسر "غیر اسلامی" اور حقائق کے خلاف ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور چونکہ علیحدگی کی اسکیم کی بنیاد ہی اس "مفروضہ" پر ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اس لئے اذا فات الشرط فات المشروط۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ وہ جداگانہ قوم ہی نہیں تو پھر جداگانہ حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا فرماتے ہیں۔

"دو قوموں کا نظریہ بالکل باطل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو خود دوسرے مذاہب چھوڑ کر مسلمان ہوئی ہے یا ان کے آبا و اجداد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے محض مسلمان ہو جانے سے وہ ایک جداگانہ قوم نہیں بن سکتے۔ بنگال کا مسلمان وہی زبان بولتا ہے جو وہاں کا ہندو بولتا ہے۔ وہی کچھ کھاتا ہے۔ انہی چیزوں سے دل بہلاتا ہے۔ جن سے ان کا ہندو ہمسایہ دل بستگی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ ان کا لباس ایک جیسا ہوتا ہے۔ میرے لئے اکثر بیرونی

علامات کی بناء پر ایک مسلمان بنگالی اور ہندو بنگالی میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ..... جب میں نے سر علی امام (مرحوم) کو پہلی دفعہ دیکھا۔ میں قطعاً محسوس نہ کر سکا کہ وہ ہندو نہیں ہیں۔ ان کی گفتگو۔ لباس۔ آداب و اطوار۔ خوراک سب وہی تھے جو ان ہندوؤں کے تھے جن میں وہ رہتے تھے ..... جب میں پہلی مرتبہ قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح سے ملا ہوں۔ تو پہچان ہی نہیں سکا کہ وہ مسلمان ہیں ..... ان کی قومیت تو ان کے چہرے اور آداب و اطوار پر لکھی ہوئی تھی۔ قارئین یہ سنکر حیران ہوں گے کہ میں کئی دنوں تک نہیں مہینوں تک مسٹر ٹیل (آں جہانی) کو مسلمان ہی سمجھتا رہا کیونکہ وہ ڈاڑھی رکھتے تھے اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے ..... پس ہندو اور مسلمان دو قومیں نہیں ہیں جنہیں خدا نے ایک بنا دیا ہو۔ انسان انہیں کبھی دو نہیں بنا سکتا ..... میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات) کے مذاہب ہیں کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے کیونکہ میرا یہ قلبی عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے۔ اور ہم تمام ایک ہی خدا کے عیال ہیں۔ خواہ ہم کسی نام سے کیوں نہ پکارے جائیں میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے۔ اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں؟ - (ہندوستان ٹائمز، ۴ ۱۰ اپریل ۱۹۴۰ء)

ملاحظہ فرمائیے آپ نے وہ تمام دلائل جن کی بنا پر گاندھی جی کے نزدیک مسلمان ایک الگ قوم نہیں بن سکتے؟ یعنی (۱) ہندوستان کے مسلمان چونکہ نو مسلم ہیں۔ یا نو مسلموں کی اولاد ہیں۔ اس لئے تبدیلی مذہب سے قومیت کی تبدیلی بھی نہیں ہو سکتی۔

(۲) ہندو اور مسلمان چونکہ ایک زبان بولتے ہیں ایک جیسا لباس پہنتے ہیں۔ ایک جیسا کھاتے پیتے ہیں۔ بظاہر دیکھنے سے ایک دوسرے سے پہچانے نہیں جاتے۔ اس لئے ایک قوم کے افراد ہیں۔

(۳) زبان۔ لباس۔ خوراک۔ آداب و اطوار کی یکسانیت کی بنا پر خدا نے انہیں

ایک قوم بنا دیا ہے۔ اس لئے کوئی انسان ان کو الگ الگ قومیں قرار نہیں دے سکتا۔

(۴) قرآن اور گیتا کا خدا ایک ہے۔

(۵) ہم سب ایک ہی خدا کے عیال ہیں۔

(۶) ہندو مت اور اسلام ایک ہی کلچر اور ایک ہی نظریۂ زندگی پیش کرتے ہیں۔

اگر آپ کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ دلائل کس کی طرف سے دئے گئے ہیں تو آپ ان کے طفلانہ پن پر اپنی ہنسی نہ تھام سکیں لیکن چونکہ یہ دلائل اس کی طرف سے ہیں جسے ایک قوم دنیا کا سب سے بڑا انسان مانتی ہے اس لئے مجبوراً انہیں درخورِ اعتنا سمجھنا پڑتا ہے گاندھی جی نے اکثر اس دعوے کا اعادہ کیا ہے۔ کہ انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ قرآن بھی پڑھا ہے اور سیرت مقدسہ پر بھی عبور ہے۔ اگر ان کا یہ دعوے صحیح ہے تو حیرت ہے کہ وہ کونسا قرآن اور کونسی سیرت کی کتاب تھی جس کے مطالعہ نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچا دیا جس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد یہ دلائل انہوں نے اس شرح وبسط سے پیش فرمائے ہیں۔ ہم گاندھی جی کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ سب باتوں سے قطع نظر صرف اسلام کے اولیں دور کی تاریخ کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ وہ انہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ اس حقیقت سے تو کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نبی اکرم صلعم نے اسلام کے ذریعہ سے ایک جدید قوم تیار فرمائی تھی جسے ملت اسلامیہ کہا جاتا تھا۔ وہ قوم جسے قرآنِ کریم نے کہیں خیر امتہ کہا۔ کہیں اسے امت وسطیٰ قرار دیا۔ کہیں انہیں حزب اللہ (اللہ کے گروہ) کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ اور ہر مقام پر یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جماعت مومنین) سے مخاطب کیا۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ اسلام نے آکر ایک نئی قوم کی تخلیق کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئی قوم بنی کیسے تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام کے تمام مسلمان یکسر نو مسلم (Converts) تھے کفر کو چھوڑ کر ایمان لائے تھے۔ پھر ان کے بعد کے مسلمان انہی نو مسلموں کی اولاد تھے سو اب غور فرمائیے کہ اس کے بعد گاندھی جی کی دلیل میں کیا وزن رہ گیا کہ ہندوستان کے مسلمان چونکہ نو مسلم ہیں یا نو مسلموں کی اولاد ہیں۔ اس لئے وہ تبدیلی مذہب سے قومیت تبدیل نہیں کر سکتے۔ اگر حضرت عمرؓ بن خطاب

اسلام لانے کے ساتھ ہی ایک جدید قوم کے فرد بن گئے تھے اگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک نومسلم (Converts) کی اولاد ہونے کے باوجود امت مسلمہ کے فرد تھے - اور اپنے والد کی پرانی قومیت سے انہیں کوئی علاقہ نہیں رہا تھا - تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کا نومسلم یا اس نومسلم کی اولاد تبدیلی مذہب کے بعد بھی قومیت کے لحاظ سے ہندو کیسے رہے گی ! آپ نے غور فرمایا کہ یہ خیال کہ یہاں کے مسلمان کبھی ہندو ہوتے تھے - کس طرح گاندھی جی کے سینہ پر سانپ بنکر لوٹ رہا ہے اور وہ کس طرح تلملا رہے ہیں کہ یہ نومسلم - اگر مذہب کو سردست نہیں چھوڑ سکتے - تو کم از کم اپنے دامن قومیت کو آبا و اجداد سے وابستہ نہ رکھیں - اس کے بعد انہیں پھر سے ہندو دھرم کے آغوش میں لے لینا مشکل نہ ہوگا -

---

اب اس کے بعد ذرا زبان - لباس - خوراک - شکل و شباہت کی یکسانیت کو لیجئے جس کی بنا پر گاندھی جی ہندو - مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے رہے ہیں اس کے لئے بھی آپ کو اسلام کے دور اولیٰ کی تاریخ پر نگاہ ڈالنی ہوگی - کفار عرب میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے تھے - ان کی زبان وہی تھی - لباس وہی تھا - کھانے پینے کے انداز وہی تھے (وہی کھجوریں اور وہی اونٹنی کا دودھ) شکل و شباہت ایک جیسی تھی - میدان بدر میں ابوجہل اور ابوبکر صدیقؓ ایک جیسا لباس پہنے ایک جیسے ہتھیار باندھے - ایک ہی زبان بولتے اور ایک جیسی شکل و شباہت لئے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے - حتیٰ کہ مسٹر پٹیل اور آس جہانی کی طرح ابوجہل و ابولہب کی بھی ڈاڑھیاں موجود تھیں - لیکن ان تمام ظاہری یکسانیت کے باوجود ان دونوں (یعنی حضرت ابوبکرؓ اور ابوجہل) کے درمیان ایک اختلاف عظیم تھا - ایک افتراق وسیع تھا - اور وہ اختلاف کفر و ایمان کا اختلاف تھا جو ان دونوں کو دو الگ الگ قوموں میں تقسیم کرتے - نسل - رنگ - خون - وطن کے اشتراک کے باوجود شمشیر بکف ایک دوسرے کے مدمقابل لے آیا تھا - اور اس انداز سے کہ باپ ایک طرف تھا اور بیٹا دوسری طرف - چچا ایک طرف اور بھتیجا دوسری طرف - داماد ایک طرف تھا اور خسر دوسری طرف یہ

تھا اسلامی نقطۂ نظر قوموں کی تقسیم کے متعلق۔ ان میں کوئی ذاتی مخاصمت نہ تھی تقسیم جائداد کے جھگڑے نہ تھے۔ خاندانی رقابتوں کی مناقشت نہ تھی۔ اختلاف تھا تو صرف ایک اور وہ تھا فقط کفر اور ایمان کا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ایک قوم ہونے کے جس قدر معیار گاندھی جی نے قائم کئے ہیں ان میں سے کونسا معیار تھا جو ابوجہل اور حضرت ابوبکر صدیقؓ میں مشترک نہ تھا۔ لیکن اس اشتراک کے باوجود کیا آج کوئی شخص ایسا ہے جو یہ کہہ سکے کہ (نعوذ باللہ) ابوجہل اور حضرت ابوبکرؓ ایک قوم کے فرد تھے! یہ جس قدر معیار گاندھی جی نے قائم کئے ہیں سب انسانوں کے وضع کردہ ہیں۔ لیکن جس معیار کے مطابق ابوجہل و ابوبکر صدیقؓ مختلف قوموں میں تقسیم ہوگئے تھے وہ معیار خدا کا قائم کردہ تھا۔ لہذا جنہیں خدا نے دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہو۔ کونسا انسان ہے جو انہیں ایک قوم بنا سکتا ہے! یہ خدائی تقسیم کا ہی تو نتیجہ تھا کہ ایک ہی ملک۔ ایک ہی شہر کے باشندے۔ ایک نسل۔ ایک قبیلہ ایک خاندان کے فرد۔ ایک زبان بولنے والے۔ ایک جیسا لباس پہننے والے ایک جیسی ظاہری شکل و شباہت رکھنے کے باوجود۔ ابوجہل کی لڑکی کی شادی ابوبکرؓ کے لڑکے کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ ناجائز تھی۔ حرام تھی۔ اس وقت بھی حرام تھی اور آج بھی (ایک مسلم اور مشرک کی شادی) حرام ہے لیکن اس کے برعکس۔ اختلافِ وطن۔ اختلافِ نسل۔ اختلافِ رنگ۔ اختلافِ زبان اختلافِ لباس کے باوجود بلالِ حبشیؓ کے نکاح کے لئے بڑے بڑے سردارانِ قریش اپنے ہاں کے رشتے پیش کرتے تھے۔ یہ کیا تھا! وہی خدا کی تقسیم کہ جونہی ایک شخص نے کہا۔
لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ۔ وہ اپنے سابقہ تمام تعلقات کو منقطع کر کے ایک جدید قوم کا فرد ہو گیا۔ کہ جس طرح دنیا کی کوئی طاقت ایک قطرے کو سمندر سے الگ نہیں کر سکتی اسے بھی کوئی اس نئی قوم سے الگ نہیں کر سکتا!

یہ ہے مہاتما صاحب! اسلام کا معیارِ قومیت یہ زمانہ علم و بصیرت کا عہد ہے اس میں نری مہاتمائیت سے ہندو دس بیس پتھر پوجنے والی قوم میں تو کام چل سکتا ہے۔ فہم و دانش رکھنے

والے ان باتوں سے نہیں بھٹکائے جاسکتے۔ اگر ہو سکے تو کوئی ایسی دلیل پیش کیجئے جو علم و دانش کے معیار پر بھی پوری اترے۔ اور اگر ظاہری یکسانیت ہی معیار قومیت ہے تو ذرا مہاتماجی سے پوچھئے کہ جرمنی کے یہودی اور وہاں کے ایک عیسائی میں شکل و صورت - لباس - وضع قطع - زبان وغیرہ میں کیا فرق ہے؟ اس کے باوجود وہ ایک قوم کے افراد نہ بن سکے - دُور کیوں جائیے - ایک انگریز اور ایک جرمن کو لیجئے کوئی شخص ان کی ظاہری ہیئت سے ان میں تمیز نہیں کر سکتا لیکن فرمائیے کیا وہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں - اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے -

پھر آپ فرماتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کی یہ بھی دلیل ہے کہ قرآن کا خدا وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے - سبحان اللہ - کیا لاجواب دلیل لاتے ہیں -

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ذرا ان سے پوچھئے کہ کیا گیتا اور انجیل کا خدا ایک نہیں! اگر ایک ہی ہے تو پھر انگریز اور ہندو مختلف قوموں کے افراد ہیں یا ایک ہی قوم ہیں - انگریزوں اور ہندوؤں کو کیوں الگ الگ قومیں قرار دیا جا رہا ہے؟ اور اشتراکِ معبودیت کے لئے صرف قرآن اور گیتا ہی کو کیوں مخصوص کیا گیا ہے؟ خدا ہی جانے یہ مہاتماجی کس آسمان سے بولتے ہیں -

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اور اس بیان کی آخری دلیل تو واقعی اس زمین کی نہیں کسی آسمان سے اتری ہوئی ہے یعنی یہ کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی خدا کے عیال (Children) ہیں - اس لئے ایک ہی قوم کے فرد ہیں یعنی ہندو اور مسلمان ایک خدا کی اولاد ہیں - اور انگریز - جرمنی - فرانسیسی اطالوی جبشی - روسی یہ نعوذ باللہ الگ الگ خداؤں کی مخلوق ہیں - اس لئے الگ الگ

قومیت رکھتے ہیں! اور اگر یہ بھی اسی ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں۔ تو ساری دنیا کے انسان ایک ہی قوم ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کی اس میں تخصیص کیا ہے! سچ فرمایا ہے شیخ سعدیؒ نے کہ

تا مرد سخن نگفتہ باشد — عیب وہنرش نہفتہ باشد

اور پھر یہ بھی سنا آپ نے کہ مہاتما جی فرماتے ہیں کہ یہ تصور کہ اسلام اور ہندو مت دو الگ الگ کلچر اور نظریات حیات کے مذاہب ہیں میری روح میں بغاوت پیدا کرتا ہے۔ یہ تصور خدا کی ہستی سے انکار کے مرادف ہے"

ذرا جمعیت العلماء کو آواز دینا! وہ فرماتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ایک ایسا شعبہ قائم ہوگا جو مسلمانوں کے مخصوص کلچر اور نظریاتِ حیات کا محافظ ہوگا اور ان سے متعلقہ احکام صرف وہی شعبہ جاری کر سکے گا۔ ان کے رہبر کا تو فیصلہ یہ ہے کہ یہ خیال کہ اسلام کسی الگ کلچر کا حامل ہے۔ خدا سے انکار کا مرادف ہے!

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما!

مثل مشہور ہے کہ جس نتھ بنوانے کو پھرے وہ ناک کاٹنے کو پھرے "یہ حضرات اسلامی کلچر کے تحفظ کے خواب دیکھ رہے ہیں اور مہاتما جی اس تصور ہی کو الحاد و زندیقیت قرار دے رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ "نہاہا تما گاندھی کی رہنمائی ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے"۔

(رانشرپتی مولانا ابوالکلام آزاد)

یہ ہے برادران! گاندھی جی کے استدلالات اور یہ ہے ان اسفندرت کی حقیقت۔
گاندھی جی اپنے ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں۔
"میں ایک تنگ نظر ہندو مت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا..."

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ تہذیبیں اب ایک دوسری میں مدغم ہونی شروع ہو گئی ہیں...... لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں ۔۔ (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۵ مئی ۱۹۴۰ء)

ہمارا خیال ہے کہ اس مضمون میں گاندھی جی نے ہندوستان کی موجودہ سیاسی کشمکش کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اسلام ایک جداگانہ تشخص رکھتا ہے۔ اپنا الگ امتیازی نشان رکھتا ہے اور یہی جداگانہ تشخص اور الگ امتیازی نشان ہے جسے اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ اور یہی تہذیب ہے جو ہر ہندو کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتا یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کا یہ امتیازی نشان مٹا دیا جائے۔ مسلمانوں سے پیشتر جتنے لوگ ہندوستان میں آئے۔ ہندوؤں نے ان کے ساتھ یہی کیا۔ ان کی تہذیب کو اپنے اندر مدغم کرنا شروع کیا۔ اور جب وہ اپنے جداگانہ تشخص کو یوں کھو بیٹھے۔ تو خود بخود ہندو قوم کا جزو بن گئے۔ یونانی۔ پارتھین۔ سیتھین ہن۔ کتنی مختلف قومیں یہاں آئیں۔ لیکن آج ان کا کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ ان سب کو یہ اکال الامم نگل گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ بھی اس نے یہی کچھ کرنا چاہا لیکن یہ ہڈی ذرا سخت تھی۔ آسانی سے نگلی نہ گئی۔ بایں ہمہ ہندو نے اپنی کوشش نہیں چھوڑی۔ دینِ الٰہی۔ برہمو سماج۔ کبیر پنتھ۔ ست سنگ وغیرہ تحریکیں اسی کوشش ناکام کی مختلف شاخیں تھیں۔ اور یہی کوشش آج "ایک قوم" اور "ایک ملک" کے نئے لباس میں جلوہ پیرا ہو رہی ہے واردھا کی تعلیمی اسکیم بھی اسی شاخ کا شگوفہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی برہمو سماجی تغیر بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی تھی ؏

یہ تو ہے ہندوؤں کا نقطۂ نگاہ۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا نظریہ۔ خود گاندھی جی کے الفاظ میں یہ ہے کہ مسلمان ایک الگ تہذیب رکھتے ہیں اور یہ تہذیب کسی دوسری تہذیب میں مدغم

نہیں ہوسکتی ۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی دوسری قوم کا جزو نہیں بن سکتے ۔ چونکہ لیگ کی یہ روش ہندوؤں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا رہی ہے اس لئے یہ اس کا اتنا بڑا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا ۔ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے ! ہندو اس کی مخالفت کیوں کرتا ہے ! یہ سب کچھ گاندھی جی نے اپنے ان چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے ۔ اب ہم اپنے قومیت پرست حضرات سے بالعموم اور ان میں سے حضرات علماء کرام سے بالخصوص دریافت کرتے ہیں کہ اس کے بعد ان کے پاس اپنے مسلک کے جواز میں کونسی دلیل رہ جاتی ہے ! یہ حضرات ہمیشہ اس امر کا اعلان کرتے ہیں ۔ کہ ہم اسلامی تہذیب کے محافظ ہیں ۔ ہم ہندوستان کے مستقبل کے نظام حکومت میں اسلامی تمدن و تہذیب کے تحفظ کا پورا پورا انتظام کریں گے ۔ ذرا غور فرمائیے کہ جو کچھ گاندھی جی فرما رہے ہیں اس کے بعد اسلام کی جداگانہ تہذیب اور اس تہذیب کے تحفظ کا کوئی سوال باقی رہ جاتا ہے ! کیا یہی وہ چیزیں نہیں جس کی بنا پر مسلم لیگ گشتنی اور گردن زنی قرار دی جا رہی ہے ۔ ہم حیران ہیں کہ یا تو یہ حضرات اس قدر سادہ لوح ہیں کہ اتنی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور یا یہ اتنی گہری سازش ہے جس کے یہ حضرات دیدہ دانستہ کل پرزے بنے ہوئے ہیں ! اس کے سوا کوئی تیسری چیز تو ہماری سمجھ میں آتی نہیں

اس کے بعد گاندھی جی اپنے محولہ صدر مضمون میں فرماتے ہیں کہ

"مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے ۔ اور انسان اور انسان میں رشتہ پیدا کر دے ۔ کیا اسلام صرف ایک مسلمان ہی کو دوسرے مسلمان سے ملاتا ہے اور ہندو کی مخالفت سکھاتا ہے ! کیا رسول اکرم ؐ کا پیغام مسلمانوں کو اپنے اندر ہی امن و سلامتی کی تلقین کرتا تھا اور ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کرنا سکھاتا تھا ! کیا ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کے قلوب کی پرورش اس چیز سے کی جائے گی جسے میں زہر ہلاہل کے سوا اور کچھ قرار نہیں دے سکتا ۔ وہ لوگ جو اس زہر کو مسلمانو کے دلوں میں بھر رہے ہیں ۔ وہ اسلام کے ساتھ بہت بڑی بدخواہی کر رہے ہیں ۔ میں جانتا ہوں

کہ اسلام یہ نہیں ہے۔ میں مسلمانوں میں ایک آدھ دن نہیں مسلسل بیس برس سے رہتا چلا آرہا ہوں۔ مجھے تو کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا نہیں بتایا کہ اسلام۔ ہندو مت کے مخالف ہے۔" (ایضاً)

ہم گاندھی جی سے یہ پوچھتے ہیں کہ ان کے اصول کے مطابق تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ . . .

. . . . ان کا دھرم انہیں تمام انسانوں سے محبت دامن اور سلامتی کی تلقین کرتا ہے! جب ان کا دھرم انہیں یہ سکھاتا ہے تو وہ ہندوستان میں رہنے والوں کو ایک الگ قوم قرار دے کر انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کیوں لڑ رہے ہیں! کیا انگریز انسان نہیں اور کیا ان کی حکومت انسانوں کی حکومت نہیں ہے! پھر اس حکومت کو لعنت کیوں قرار دیا جا رہا ہے۔ کیا یہ ہندوستانی اور انگریز کی تفریق۔ انگریزوں کے خلاف جذبۂ منافرت پیدا نہیں کرتی! کیا گاندھی جی جذبۂ منافرت کی زہر ہندوستانیوں کے دلوں میں نہیں بھر رہے! کیا یہ ایک انسان کو دوسرے سے جدا کرنا نہیں! کیا ان کا دھرم صرف ایک ہندوستانی کو دوسرے ہندوستانی کے ساتھ ملانے کا ہی سبق دیتا ہے۔ گاندھی جی کو یہ کہنا پڑے گا کہ ہندوستانی ایک جداگانہ قوم ہیں اور انگریز ایک جداگانہ قوم۔ اور ان کی یہ تمام جدوجہد انگریز کے خلاف نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی تائید میں ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو ان کا حق دلانے کی خاطر جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں اور یہ کوئی جرم نہیں! جرم اس وقت تھا جب انگریز کے ساتھ ظلم کیا جاتا! اس جواب کے بعد مسلمانوں کی پوزیشن کو سمجھیئے۔ گاندھی جی کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے انسان سے متمیز کرنے کا معیار وطن ہے اس لئے ان کے نظریہ کی رو سے ہندوستان کے رہنے والے ایک الگ قوم۔ اور انگریز ایک دوسری قوم ہیں۔ اور ایک قوم کو کوئی حق حاصل نہیں کہ دوسری قوم پر غلبہ و تسلط حاصل کرے۔ اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو اس کے خلاف جدوجہد کرنا کوئی جرم نہیں اسی طرح اسلام نے بھی ایک انسان کو دوسرے انسان سے متمیز کرنے کا ایک اصول قائم کیا ہے۔ وہ اصول وطنی حدود نہیں۔ بلکہ مذہب ہے۔ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے وہ ایک الگ قوم کا فرد ہو جاتا ہے۔ اور جو نہیں کرتا وہ دوسری قوم سے متعلق ہو جاتا ہے۔ بس اتنا فرق سمجھ لینے کے بعد باقی سب باتیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ مسلمانوں

کے نقطۂ نگاہ سے چونکہ ہندو ایک الگ قوم ہیں اسی لئے وہ ہندوؤں کے غلبہ و تسلط کو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ جس طرح گاندھی جی انگریز کے غلبہ و تسلط کو "بدیشی" قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط کو (خواہ وہ انگریز کا ہو یا ہندو کا) "بدیشی" (یعنی غیر اسلامی) سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اور اس غلبہ و تسلط کے خلاف پوری پوری جد و جہد کرنا ان کے نزدیک جہاد ہے۔ مقدس فریضۂ مذہبی ہے۔ جس طرح گاندھی جی کے نزدیک یہ جد و جہد ایک قومی اور وطنی فریضہ ہے۔ مسلمانوں کی یہ جد و جہد نہ کسی کی مخالفت ہے۔ نہ امن و سلامتی کے منافی۔ اس لئے کوئی جرم نہیں جرم اس وقت ہوتا جب یہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرتے۔ ان پر ظلم کرتے۔

گاندھی جی انگریزوں سے اپنا حق چھیننے کے لئے یہ جد و جہد کریں تو وہ عین شرف انسانیت اور مسلمان ہندوؤں سے اپنا حق واپس لینے کے لئے جد و جہد کریں تو یہ انتہائی وحشت و بربریت!

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

باقی رہا اسلام کا (Anti-Hindu) ہونا۔ سو اگر (Anti) کے معنی ایسی مخالفت ہے جس میں ظلم و عدوان پایا جائے۔ تو اسلام دنیا میں قطعاً Anti-Hindu نہیں کسی مذہب کا بھی ایسا مخالف نہیں۔ کسی انسان کا بھی ایسا دشمن نہیں۔ اس لحاظ سے وہ سرتاپا امن و سلامتی کا پیغامبر ہے کہ وہ کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا۔ لیکن اگر (Anti) سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف اپنے آپ کو خدا کا سچا مذہب سمجھتا ہے۔ اور کسی کو حق پر نہیں مانتا۔ تو ہمیں اس امر کے اعلان کرنے میں قطعاً تامل نہیں کہ اسلام دنیا کے ہر مذہب۔ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظریہ اور اپنے متعین کردہ نظام کے سوا دنیا کے ہر نظام کو باطل سمجھتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ط

اللہ کے نزدیک اگر کوئی دین ہے تو صرف اسلام ہے۔ جو اس کے سوا کسی اور دین کو دین حق سمجھتا ہے تو باطل پرست ہے۔ اس کا وہ دین قطعی قابل پذیرائی نہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اس کا وہ دین کبھی قبول نہیں کیا جاوے گا۔ اس نے اپنی بعثت کا مقصد بھی یہ بیان کیا ہے کہ وہ تمام ادیان عالم پر غالب آجائے۔

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دین حق کے ساتھ بھیجا کہ وہ دین تمام ادیان پر غالب آجائے خواہ یہ بات مشرکین کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ اس نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا حق آگیا اور باطل دور ہو گیا کیونکہ باطل کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ حق آئے پر وہ کافور ہو جاتا ہے۔

گاندھی جی کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر دس بیس برس کے عرصہ میں کسی مسلمان نے انہیں قرآن کریم کی یہ صریح آیات پڑھ کر نہیں سنائیں تو اس نے اسلام کے ساتھ غداری کی ہے۔ اور گاندھی جی کے ساتھ فریب کاری کی یا در ہے کہ اسلام کا یہ دعوے کسی تنگ نظری یا تعصب پر مبنی نہیں۔ بلکہ جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کا قانون ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ دو متضاد قوانین ایک ہی فطرت کے قانون نہیں ہو سکتے۔ لہذا اگر کسی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ہلاکت کا موجب ہے۔ کوئی تعصب یا تنگ نظری نہیں تو کسی غیر اسلامی (یعنی غیر فطری) نظریۂ زندگی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ زندگی بخش نہیں (لہذا باطل ہے) کوئی برائی نہیں "مذہبی جنون" نہیں حق کو حق کہنا عین انصاف ہے۔ خواہ اس سے ساری دنیا ناراض کیوں نہ ہو جائے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

(مولانا محمد علی مرحوم)

پھر گاندھی جی فرماتے ہیں کہ ذرا ان مسلمانوں کو دیکھئے ان کے نزدیک ۔

"ہندو حکومت کے ماتحت رہنا گناہ ہے حتیٰ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت بھی ان کے نزدیک ناقابل تصور ہے" (ایضاً)

لیکن مہاتما جی نے اتنا نہیں سوچا کہ خود ان کی اپنی کیا حالت ہے ۔ پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت کا تصور ان کا خون کھولا رہا ہے حتیٰ کہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ اس اسکیم کی مخالفت میں اپنے اہنسا کی پوری قوتیں صرف کر دیں گے ۔ حالانکہ گاندھی جی پر اس کے متعلق کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں ہوتی ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہم باب اول میں لکھ چکے ہیں کہ ان کے نزدیک کسی غیر مسلم کی حکومت کے ماتحت رہنا گناہ ہی نہیں بلکہ غیر اسلامی زندگی ہے ۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت کا تصور بھی روحِ اسلامی کے منافی ہے ۔ اس لئے مسلمان اگر ایسی حکومت کے ماتحت رہنے کو گناہ سمجھتے ہیں تو بالکل حق بجانب ہیں ۔ ان کے نزدیک یہ ویسی ہی غلامی ہے جیسی انگریز کی خواہ یہ خالص ہندوؤں کی حکومت ہو یا ایسی حکومت جس میں اکثریت ہندوؤں کی ہو دونوں قرآن کی رو سے ناجائز اور اس لئے مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہیں ۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۔ مصیبت یہ ہے کہ گاندھی جی ۔ یا ان کے ہمنوا حضرات کو اسلام کے متعلق واقفیت تو کچھ ہے نہیں ۔ اور دعوے ہمہ دانی کا کرتے ہیں ۔ اس سے بڑھ کر یہ مصیبت کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ ان کے حاشیہ نشین ہیں وہ بھی یا تو روحِ اسلامی سے بالکل کورے ہیں یا اگر اس سے واقف ہیں تو اس جرأت ایمان سے محروم ہیں جو ان میں حق گوئی کی قوت پیدا کر دے نتیجہ یہ کہ گاندھی جی آئے دن اس قسم کے فتاویٰ صادر فرماتے رہتے ہیں کہ فلاں چیز اسلام کے خلاف ہے اور فلاں نظریہ اسلام کے عین مطابق ہے ۔ اور قومیت پرست "علماء کرام" سب کچھ سنتے ہیں ۔ اور ایک لفظ تک اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتے ۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہندو ارباب سیاست کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آگاہ کیا جائے تو اس کے بعد وہ اپنے خفیہ منصوبوں کو اسلام کے نقاب میں پیش کرنے کی جرأت تو نہ کر سکا کریں ۔ لیکن آج یہ کون کہے ۔ ایک کہنے والے تھے

انھیں بھی کارپردازانِ قضا و قدر نے ہم سے چھین لیا۔ سچ کہا تھا اس مردِ قلندر نے کہ

ازتب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازیں نایدچو من مردِ فقیر

(اقبالؒ)

پھر گاندھی جی فرماتے ہیں ۔

"اگر پاکستان محض ایک دھمکی ہی نہیں بلکہ ایک قابلِ قبول (Desirable) نصب العین ہے تو پھر اس کی مخالفت کیوں کی جائے ۔ لیکن اگر یہ ناقابلِ قبول (Indesirable) ہے اور اس سے مقصد محض یہ ہے کہ مسلمان اس کی آڑ میں زیادہ کچھ حاصل کر لیں تو پھر اس کا کوئی حل بھی ہو۔ وہ ناانصافی پر مبنی ہو گی اس لئے میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں کہ کب یہ بیتا دور ہو" (ایضاً)

"زیادہ حاصل کرنے" کا طعنہ بھی آپ نے سنا؟ ایک کم تولنے والے بنیا سے اگر آپ لڑ جھگڑ کر پورے تول کا سودا خرید لیں ۔ تو آپ کے معیار کے مطابق وہ پورا ہو گا ۔ لیکن بنیا کے نزدیک وہ زیادہ ہو گا ۔ مسلمان چاہتے کیا ہیں ۔ فقط اتنا کہ جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور گاندھی جی کے نزدیک مسلمان ڈرا دھمکا کر زیادہ کچھ حاصل کرنے کی ٹھان رہے ہیں ۔ گاندھی جی کے نزدیک "پورا تول" تو اس وقت ہو گا جب مسلمان خاموشی سے اکثریت کی حکومت قبول کر لیں اور اس کو آزادی قرار دیدیں ! لیکن گاندھی جی سے کہہ دیجئے کہ وہ سوداگر گئے جو اس قسم کے سودے کیا کرتے تھے ۔

اِس عہد میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

غیر مسلم اقلیتیں

اس اسکیم کی مخالفت میں جو سب سے بڑا حربہ استعمال کیا جارہا ہے وہ غیر مسلم اقلیتوں کو یہ کہکر مشتعل کرنا ہے کہ اس اسلامی حکومت میں تمہارے حقوق پامال ہوجائیں گے۔ اس لئے تمہیں پورے زور اور قوت کے ساتھ اس کی مخالفت کرنی چاہیئے چنانچہ اس باب میں پنجاب کے سکھوں کو بہت زیادہ بھڑکایا جارہا ہے۔

قرآنی حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں دینا چاہتے۔ یہ حکومت ضابطۂ قرآنی کے ماتحت ہوگی۔ اس لئے اس کے جواب کے لئے قرآن کریم کا مطالعہ کرلینا کافی ہے قرآن کوئی "گپت ودیا" (علم مخفی) نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں اس کے تراجم موجود ہیں جس کا جی چاہے اٹھاکر دیکھ لے کہ اس کی رو سے غیر مسلموں کو کس درجہ آزادی حاصل ہوگی۔ "اسلام اور مذہبی رواداری" ایک جلد اگانہ عنوان ہے اور اس عنوان پر ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے ایک مفصل پمفلٹ شائع ہوچکا ہے اس کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہوجائے گی کہ قرآنی حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کس قدر عدل و انصاف کا سلوک ہوگا۔ ایسا سلوک کہ جب حمص کی عیسائی رعایا کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جارہے ہیں تو وہ روتے تھے اور منتیں کرتے تھے کہ خدا کے لئے تم نے جلدی واپس آجانا۔ کہیں ہمیں دوبارہ رومیوں کے ماتحت نہ ہوجانا پڑے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ رومی کون تھے؟ عیسائی تھے! یعنی عیسائی رعایا یہ کہ رہی ہے کہ ہم مسلمانوں کی حکومت میں رہنا چاہتے ہیں۔ عیسائیوں کی حکومت میں نہیں رہنا چاہتے۔ حسن سلوک اور تحفظ حقوق کی اس سے بڑھکر اور کیا مثال ہوسکتی ہے!

قرآن کریم تو یہاں تک حکم دیتا ہے کہ

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔

یعنی اسلام تو دشمن سے بھی عدل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ لوگ جن کی حفاظت

کی ذمہ داری اس نے خود لے لی ہو۔ اس باب میں قرآن کریم۔ احادیث۔ آثار و شواہد اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی شخص کو مجال انکار نہیں ہو سکتی کہ اسلام اپنی غیر مسلم رعایا سے کس حسن سلوک کا برتاؤ کرتا ہے۔

علاوہ بریں۔ ذرا ایک ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر تمام ہندوستان میں جمہوری نظامِ حکومت قائم کیا جائے تو ہندو اکثریت۔ اقلیتوں کے تحفظِ حقوق کی ذمہ دار ہوگی یعنی وہ ہندو جس کے مذہب میں کوئی غیر ہندو انسان بھی نہیں کہلا سکتا۔ اسے "ملیکش" کہا جاتا ہے۔ وہ غیر ہندوؤں کے حقوق کی نگہداشت کریں گے! وہ ہندو جن کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے ہزارہا سال سے کروڑوں اچھوتوں کو انسانیت کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے اور ان کا یہ سلوک ان کے ذاتی رجحانات کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کا مذہب انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ ایسا ہی کریں۔ اِن ہندوؤں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان پر پورا پورا اعتماد کرو۔ یہ اقلیتوں کے ساتھ مساوات کا سلوک کریں گے۔ ان سے پوچھئے کہ آپ نے آج تک خود "اپنوں" کے ساتھ کیا کیا ہے جو دوسرے آپ پر بھروسہ کریں!

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ لازم آید ز تو احتراز کردن

اِن ہندوؤں پر تو بھروسہ کرو لیکن مسلمانوں پر بھروسہ نہ کرو جن کا مذہب انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ کبھی کسی حال میں بھی جادۂ عدل و انصاف سے ادھر ادھر نہ ہونے پائیں۔ وہ مسلمان جن کی تاریخ کے اوراق آج بھی دنیا کو بتا رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی حکومت میں غیروں کے ساتھ کیا سلوک کیا! وہ مسلمان جن کی عطا کردہ جاگیریں آج بھی ہندوؤں کے سینکڑوں مندروں کی کفالت کا موجب ہیں۔ وہ مسلمان جن کا قرآن انہیں حکم دیتا ہے کہ غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی اسی طرح کرو جس طرح تم اپنی مساجد کی حفاظت کرتے ہو (القرآن) وہ جن کا مذہب انہیں تلقین کرتا ہے کہ غیر مذہب کے معبودوں (بتوں تک) کو بھی گالی نہ دو (۶)

وہ مذہب جو انسانیت کا اس درجہ احترام سکھاتا ہے کہ اس کے نزدیک کسی ایک جان کا ناحق ضائع کرنا گویا تمام نوعِ انسانی کو ہلاک کر دینا۔ اور کسی ایک نفس کو بچالینا۔ تمام انسانیت کو زندگی عطا کر دینا ہے (القرآن)

کہا جا سکتا ہے کہ جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ انہیں غیر مسلم اکثریت کی حکومت میں مذہب کی آزادی نہیں مل سکتی تو غیر مسلم اقلیتیں یہ کیسے باور کریں کہ انہیں مسلم اکثریت کی حکومت میں مذہب کی آزادی مل جائے گی۔ اعتراض بظاہر معقول نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے جواب کے لئے ذرا باب اوّل پر ایک نگاہ پھر سے ڈالئے اور دیکھئے کہ ایک مسلمان کے نزدیک "مذہب کی آزادی" کا مفہوم کیا ہے اور ایک غیر مسلم کے نزدیک مذہبی آزادی کسے کہتے ہیں۔ مسلمان کا مذہب اس کی حکومت ہے اور مذہبی آزادی سے مفہوم ایک آزاد حکومت کا قیام ہے۔ برعکس اس کے دیگر اہل مذاہب میں مذہب سے مفہوم چند عبادات ورسومات کی ادائیگی ہے۔ اس سے آگے امورِ دنیاوی کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ آپ نے آج تک کسی ہندو۔ سکھ۔ پارسی وغیرہ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہوگا کہ انگریز کے عہدِ حکومت میں انہیں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے ! بلکہ وکٹوریا کے منشور (Magna Carta) میں ہر قسم کی مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ وہ آزادی تمام غیر مسلم اہل مذاہب کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس قسم کی مذہبی آزادی اسلام بھی دیتا ہے اور صرف آزادی ہی نہیں دیتا بلکہ ان کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لیتا ہے۔ برعکس اس کے مسلمان کو دنیا میں کوئی حکومت مذہبی آزادی نہیں دے سکتی کہ ان کا مذہب آزاد نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ حکومت بھی ان کے اپنے ہاتھ میں نہ ہو۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلام کی آزادی اور دیگر مذاہب کی آزادی میں اس لئے تمام غیر مسلم اقلیتوں کو بالکل مطمئن رہنا چاہیئے کہ مسلمان تو از روئے مذہب مجبور ہے کہ وہ انہیں مذہبی آزادی دے۔ اور اس آزادی کی ضمانت کے لئے وہ جس قسم کی شرائط چاہیں ان سے لکھوالیں۔ انہیں کسی قسم کا اعتراض ہی نہ ہوگا۔ بلکہ ان شرائط کی پابندی تو ان پر بطور فریضہ مذہبی لازم ہوگی مسلمان حاکم نہیں ہوتا۔ تحفظ حقوقِ انسانیت کے لئے چوکیدار ہوتا ہے اور خوف

چور سے ہوتا ہے چوکیدار سے نہیں ؎

باب پنجم

آزاد مسلم کانفرنس کے اعتراضات

چہ گو نمت زمسلمانِ نامسلمانے جز ایں کہ پورِ خلیل است و آذری داند

کانگریس نے مسلم لیگ کی اسکیم زیرِ نظر کی مخالفت فرداً فرداً ہر ایک قومیت پرست سے کرائی۔ لیکن اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ انفرادی ہنگامہ آرائی بالکل بے نتیجہ ہے کیونکہ لیگ کی اسکیم کی تائید ایک اجتماعِ عظیم نے کی تھی جس میں اطراف و اکناف ملک کے مسلم نمائندے شامل تھے۔ اس لئے سوچا گیا کہ کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ان قومیت پرست حضرات کی آواز کو مجموعی جمہور کی آواز بنا کر دکھا دیا جائے لیکن اس تجویز کے راستہ میں سب سے بڑا روڑا خود قومیت پرستی کا لیبل تھا۔ کیونکہ یہ حقیقت اب ایک دنیا پر ثابت ہو چکی ہے کہ قومیت پرستی ہندو پرستی کا ہی دوسرا نام ہے۔

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز ہے

اس لئے سب سے پہلے گراموفون کے ان ریکارڈوں سے قومیت پرستی کا پرانا لیبل کھرچا گیا۔ اور اس کی جگہ "آزاد مسلمان" کا نیا لیبل لگا لیا گیا۔ پھر ان آزادگانِ مذہب و ملت کو آخر اپریل میں دہلی کے مرکزی مقام میں جمع کیا گیا۔ اور ہندو اخبارات نے چاروں طرف اس جتماع کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ کہیں سرخیلِ آزادگان جناب خان بہادر اللہ بخش کے متعلق لکھا

گیا کہ ایک ازدہام عظیم نے ان کا خیر مقدم کیا۔ حالانکہ ان بڑے بڑے مولوی صاحبان سے پوچھئے کہ سوائے ان سات آٹھ حضرات کے۔ جن کا فوٹو خان بہادر صاحب کے ساتھ چھپا ہے۔ کوئی اور اسٹیشن پر موجود بھی تھا؟ (واضح رہے کہ یہ بڑھ بڑھ کر فوٹو کھنچوانے والے حضرات وہی علمائے کرام ہیں کہ فوٹو کی حرمت کے متعلق جن کے فتاویٰ آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں) کہیں صدر کانفرنس کے جلوس میں چالیس ہزار نفوس بتائے گئے۔ کہیں جلسہ کے متعلق لکھا گیا کہ پنڈال کے اندر پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ اور اگر پنڈال سے باہر کے لوگ بھی شامل کر لئے جائیں تو ایک لاکھ کا اجتماع سمجھئے (اس لئے کہ ان پروپیگنڈہ کرنے والوں نے دیکھا تھا کہ مسلم لیگ کے جلسہ میں اتنا ہی اجتماع تھا۔ اس سے انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ کانفرنس بھی لیگ سے کچھ کم نمائندہ حیثیت نہ رکھتی تھی) حالانکہ دہلی والے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ان اجتماعات کو دیکھا تھا۔ خوب جانتے ہیں کہ پنڈال کتنا بڑا تھا۔ اور اس میں حاضرین کی تعداد کس قدر تھی۔ اور اگر ان میں سے عربی مدارس کے ان طالب علموں کو الگ کر دیا جائے جنہیں خاص طور پر جلسہ میں لایا گیا تھا۔ اور ہندوؤں کو بھی خارج کر دیا جائے تو پھر باقی یا تو پنڈال رہ جاتا ہے یا اس کے منتظمین و مندوبین۔ یہ اجتماع یوں منعقد کرایا گیا۔ اس کی غرض و غایت کیا تھی! یہ ان قاری صاحبؒ نے بتا دیا جنہوں نے جلسہ کی کارروائی کا افتتاح قرآن کریم کی ان آیاتِ مقدسہ سے کیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝

اور یہ (حق سے) انکار کرنے والے (آپس میں) کہتے ہیں کہ اس قرآن (کی آواز) کو مت سنو بلکہ (ایسے وقت میں) خوب شور مچاؤ۔ شاید (اس طریقہ سے) تم کامیاب ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مولوی صاحبان قرآن کریم کو محض تبرکاً اور رسماً پڑھ دیتے ہیں۔ اس لئے معانی کی طرف کبھی ان کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔ ورنہ وہ خود محسوس کرتے کہ ان کے اس شور و غوغا کے متعلق قرآن کریم کی بارگاہ سے کیا فتویٰ صادر ہو رہا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب قاری صاحبؒ اس سے آگے چوتھی آیت پر پہنچے ہیں تو ہم قرآن کریم کے اس اعجاز پر

وجد کر رہے تھے کہ وہ کس طرح ان حضرات کی زبان سے غیر شعوری طور پر حقیقت کا اعتراف کرا رہا ہے۔ انہوں نے پڑھا کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝

اور یہ (حق سے، انکار کرنے والے (قیامت میں) کہیں گے کہ یا اللہ! ذرا ہمیں جن وانس میں سے ان لوگوں کو دکھا دے جنہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا تھا۔ کہ ہم انہیں اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں اور انہیں یوں ذلیل وخوار کریں۔

اور پانچویں آیت میں توحق پر چلنے والوں کے لئے تسکین وطمانیت کی ایک کھلی ہوئی شہادت تھی

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

(اور) جن لوگوں نے کہدیا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو گئے (ان کے قلوب کو تسکین وطمانیت دینے کے لئے) ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ مت خوف کھاؤ۔ بالکل نہ گھبراؤ۔ اور اس جنت کی بشارت لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

ان آیات کی تلاوت تو رسماً کرا دی گئی لیکن اس کے بعد (نہ حمدِ خدا نہ نعت رسول بلکہ) یکے بعد دیگرے وطن کے دیوتا کے چرنوں میں عقیدت وارادت کے پھول چڑھائے گئے۔

"جھنڈا رہے بلند ہمارا بڑھے وطن کی شان" اور "اے وطن۔ اے وطن۔ اے وطن" کی قسم کے قومی ترانے گائے گئے۔ اور جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ ہم تین دن برابر دیکھا کئے کہ بالآخر یہ علماء حضرات کا مجمع ہے۔ اس میں کسی گوشہ سے قال اللہ۔ قال الرسول کی آواز بھی اٹھتی ہے۔ یا نہیں لیکن سنئے اور حیران ہو جائیے کہ سارے جلسہ کی کارروائی میں کسی شخص کی زبان پر نہ اللہ کا نام آیا نہ اس کے رسول کا نام۔ نہ اسلام کا ذکر آیا نہ اس کے ناموس کا۔ "وطن پر مصیبت آگئی ہے" "بھارت ماتا گرداب بلا میں گھر چکی ہے" "قوم پر غربت

و افلاس کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہندی بھوکوں مر رہے ہیں اور اس قسم کے دیگر مقدس الفتنیات تھے جن کی بنا پر مسلمانوں کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہم نے مضمون زیر نظر کی اشاعت کو مئی کے رسالہ سے قصداً روک لیا تھا کہ اس کانفرنس کے اعتراضات کو بھی دیکھ لیا جائے لیکن ہمیں اب افسوس ہوا کہ اس کی اشاعت میں یونہی تاخیر روا رکھی۔ کانفرنس میں لفظاً لفظاً انہی اعتراضات کو دہرایا گیا جو اس سے پیشتر مختلف کانگریسی لیڈروں کے زبان و قلم سے نکل چکے تھے البتہ فرق یہ تھا کہ ارباب کانفرنس کے لب و لہجہ میں ہندوؤں کے مقابلہ میں تلخی زیادہ تھی۔ صدر استقبالیہ کمیٹی نے علیحدگی کی اسکیم کو "نامعقول" اور ایسے دماغ کی تخلیق قرار دیا جو "غصہ کی وجہ سے ماؤف ہو چکا ہو" اور اپنے فیصلہ کی تائید میں کسی ایک دلیل کے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ اسی طرح جناب صدر نے اسے "مہمل اور نقصان رساں" قرار دے کر تصور کر لیا کہ انہوں نے دلائل قاطع و براہین ساطع سے اس اسکیم کی تردید فرما دی ہے۔ جو کچھ ان تین چار روز میں کہا گیا ہے۔ اس کا ملخص حسب ذیل ہے۔ پہلے جناب صدر کے ارشادات کو لیجئے۔ وہ اپنے خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں۔

(۱) اسلام کا عالمگیر پیغام الگ الگ قوموں کو اپنا ہم خیال بنا کر ان کی قومی وحدتوں کو ختم نہیں کر دیتا۔ مثال کے طور پر اگر جرمنی۔ انگلستان۔ فرانس۔ جاپان کے رہنے والے مسلمان ہو جائیں تو کیا یہ لازم آئے گا کہ وہ اپنی قومیت سے دستکش ہو جائیں۔ اپنی معاشرت کو بدل دیں۔ اور اپنے تمدن کو خیر آباد کہہ دیں۔ اسلام اگر تمام انسانیت کے لئے ہے اور اسلام کا خدا سب قوموں کا خدا ہے۔ تو کسی خاص نسل۔ یا قوم۔ یا ملک تک اس کی وسعت کو محدود کر دینا کیسے ممکن ہے۔ اسلام نسلوں سے بالاتر ہے۔ فرقوں اور قوموں سے بالاتر۔ اور جغرافی اور ملکی حدوں سے بالاتر ایک عالمگیر نظام کا نام ہے۔ اور یہ ایک کھلا ہوا دھوکا ہے اور ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بے حد نقصان دہ اور تباہ کر دینے والا ہوگا اگر آج ہمیں مذہب کی بنیاد پر الگ الگ قومیں بنانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ صث

ملاحظہ فرمالی آپ نے اس مفسر سندھی کی تفسیر اسلام ؟ افسوس خان بہادر صاحب پر نہیں کہ ان بچاروں کو کیا معلوم قرآن کیا ہے۔ افسوس ہے ان "علماء عظام" پر جو ان ارشادات کو سن سنکر وجد و مسرت سے جھوم رہے تھے۔

جناب خان بہادر صاحب! جرمنی، انگلستان، فرانس یا جاپان کے رہنے والے اگر آج مسلمان ہو جائیں تو انہیں ان قومیتوں سے سب سے پہلے دستکش ہونا پڑے گا جن کی بنیاد انسانی ہاتھوں نے نسلی اور جغرافیائی حدود پر رکھی ہوئی ہے جب اسلامی وحدت پیدا ہوتی ہے تو یہ غیر اسلامی تحزب و تشیع جسے آپ "قومی وحدتیں" قرار دے رہے ہیں سب فنا ہو جاتی ہیں۔ صہیب رضؓ رومی۔ بلال حبشیؓ، سلمان فارسیؓ، حضرت عمر عربیؓ جب اسلام لائے تھے تو ان سب کی الگ الگ "قومی وحدتیں" اس ایک عالمگیر وحدت میں جذب ہو گئی تھیں جسے ملت اسلامیہ کہتے ہیں۔ آج آپ کی سمجھ میں یہ بات اس لئے نہیں آسکتی کہ آپ نے مغرب کے معیار قومیت کو "خدائی قانون" مقرر کر رکھا ہے۔ اس لئے آپ جس وقت بھی سوچتے ہیں تو اسی قانون کی حدود و قیود کو سامنے رکھکر سوچتے ہیں۔ اگر آپ قرآن کو سامنے رکھکر کچھ سوچتے تو اس بات کا سمجھ لینا زیادہ مشکل نہ تھا

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے۔ تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

لیکن یہ بت خانہ آپ ہی کے دماغ کا نہیں اس کی ابتدا تو اس دن ہوئی تھی جب ایک بہت بڑے شیخ الحدیث نے فتویٰ ارشاد فرمایا تھا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں" اور پھر یہ بھی سن رکھیئے کہ جب دنیا کی کوئی قوم اسلام لائے گی تو اسے اپنی معاشرت و تمدن کے ہر اس عنصر کو چھوڑ دینا پڑے گا جس کی روح۔ اسلام کی روح کے خلاف ہوگی۔ خواہ وہ معاشرت آپ کی نگاہ میں کیسی حسین و جاذب نظر کیوں نہ ہو۔ ہاں یہی تو وجہ ہے کہ اسلام وطن کی چار دیواری یا نسلی امتیازات کی آب و گل میں محبوس نہیں ہو سکتا کہ اس کا خدا تمام ملکوں اور قوموں کا خدا ہے۔ اور یہ پابندیاں اس کی لامحدود وسعت کو محدود کر دیتی ہیں۔ اسلام واقعی "جغرافیائی" اور ملکی حدود سے بالاتر ایک نظام کا نام ہے "سوچئے آپ کیا کر رہے ہیں اور اس کے بعد نتیجہ کیا نکال رہے ہیں"۔

اس کے بعد بھی آپ اگر سمجھتے ہیں کہ "مذہب کی بناء پر الگ الگ قومیں بنانے کی دعوت

ایک دھوکہ ہے۔ اور نقصان رساں اور تباہ کن دھوکا ہے۔ تو یہ آواز نئی نہیں ہے۔ یہ آواز بھی ظہور اسلام کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی یہی کہا گیا تھا کہ

سینۂ ما از محمد داغ داغ از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ!
مذہبِ او قاطعِ مُلک و نسب از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند آبروئے دودمانے ریختند

(جاوید نامہ۔ نوحہ رُوحِ ابوجہل در حرم کعبہ)

احمر و اسود کا یہی امتیاز تھا جسے قائم رکھنے کے لئے اس وقت واویلا کیا گیا تھا اور اسی امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے آج یہ شور اٹھایا جا رہا ہے کہ ایک انگریز اسلام لانے کے بعد اپنی قومیت سے دستکش نہیں ہو سکتا" غور فرمائیے! کیا ان دونوں آوازوں میں کچھ بھی فرق ہے۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں۔ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

(۲) متحدہ قومیت کے متعلق دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

"ہیر رانجھا، سسی پنوں کے قصے۔ جن کے لکھنے والے مسلمان تھے۔ آج سندھ اور پنجاب مسلمان ہندوؤں سکھوں سب کا مشترکہ سرمایہ ہے اور سب بغیر کسی اختلاف کے ان کو پڑھتے۔ ان سے حظ اٹھاتے۔ اور ان کو اپنا سمجھتے ہیں (صفحہ ۹)

سبحان اللہ! کیا مسکت دلیل ہے! کیوں صاحب! اگر کوئی انگریز یہ کہہ دے کہ شکسپیر و ملٹن کو آج تمام ہندوستانی مزے لے لیکر پڑھتے ہیں۔ اور ان سے حظ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے انگریز اور ہندوستانی ایک ہی قوم ہیں۔ لہذا انگریزوں کی حکومت کو اپنی ہی قومی حکومت سمجھو! تو فرمائیے جناب خان بہادر صاحب اس کا کیا جواب بن پڑیگا

(۳) پھر ارشاد ہے

"ہندوستان ایک نہ تقسیم ہونیوالی جغرافی وحدت ہے" اس کے لئے دلیل! کیا قرآن کریم میں ایسا لکھا ہے!

(۴) فرماتے ہیں:-

"ہم سب اس سارے ملک کے مالک ہیں۔ اور کوئی تبلیغی ڈھونگ اور سیاسی فریب ہمیں اس عقیدہ سے نہیں ہٹا سکتا۔" (صفحہ ۱۵)

مالک تو ضرور ہیں۔ لیکن جب ملکیت سے متمتع ہونے کا وقت آتا ہے تو پھر اسکی کیفیت اس بگائے کی سی ہو جاتی ہے جس کے سینگ مسلمانوں کے حصہ میں آتے ہیں۔ اور دودھ ہندو دوہتا ہے۔ اور پھر آپ نے "تبلیغی ڈھونگ" اور "سیاسی فریب" کے الفاظ پر بھی غور فرمایا؟

---

(۵) اسلامی حکومت کے قیام کے متعلق فرماتے ہیں:-

"ہندو اور مسلم حکومت کے خواب جو آج بعض لوگ دیکھ رہے ہیں۔ انکی پوشیدہ آرزوؤں کی آخری لہر ہے...... یہ جاہ پرست طبقہ اپنی آنکھیں کھولے اور جاہ پرستی کا انجام دہلی کے کھنڈروں میں دیکھ کر اپنی حرکتوں سے باز آئے۔ بدقسمتی سے دوسروں کو گرا کر خود آگے بڑھنے کی ہوس اور دوسروں پر کھلم کھلا کسی داؤ فریب سے حکومت کرنے کا ولولہ جاہل اور غیر مہذب لوگوں کو بہت پسند ہوتا ہے...... جو دوسروں کو اپنا سیاسی محکوم اور معاشی غلام بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں، میں نہایت خلوص سے ان کو مشورہ دونگا کہ وہ اس خواب و خیال کی دنیا کو جتنی جلدی ہو سکے چھوڑ دیں تو ان کے لئے بہتر ہے...... ضرورت ہے کہ اس بات کو جاہ پرست طبقے خوب اچھی طرح سن لیں اور اپنے دلوں سے کسی ایسے نظام کا خیال نکال دیں جس کے ذریعہ مسلمان عوام کو الّو بنا کر سیاسی اور معاشی لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کے منصوبے سوچ رہے ہیں۔ (صفحہ ۲۰-۲۱)

سُن لیا آپ نے ان باتوں کو برملا کہنے سے ساورکر، اور بدراسنکھوں کی زبانیں لڑکھڑاتی اور آنکھیں شرماتی تھیں۔ ان باتوں کو مسلم لیگ کے اس اجتماع کے صدر کی زبان سے کس جرأت و بیباکی سے ادا کرایا جا رہا ہے یعنی ہندو اگر اس ملک میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اپنی حکومت قائم کرنے کیلئے جدوجہد کرے تو وہ جنگ آزادی ہے۔ جہاد حریت ہے۔ انسانیت کا سب سے مقدس فریضہ ہے اور اگر مسلمان اسلامی حکومت کے جذبہ کو پرورش دیں تو وہ جاہ پرستی ہے۔ ہوسناکی ہے۔ داؤ فریب ہے۔ استبداد ہے۔ تغلب ہے۔ بغض ہے۔

غیر مہذب، قوموں کا شیوہ ہے۔ غرضیکہ عالم انسانیت کی ذلیل ترین حرکت ہے!

اور پھر ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ جاہ پرستی کا طعنہ کون دے رہے ہیں! جناب خان بہادر اللہ بخش صاحب۔ کہ جو وزارت میں جن کی مضحکہ انگیز حرکتوں نے فضائے ہند کو اب تک کشتِ زعفران بنا رکھا ہے کہ آج بھی جب کہیں ان کا فوٹو سامنے آتا ہے تو بے اختیار ایک تاسف انگیز و عبرت آمیز ہنسی کا محرک ہو جاتا ہے۔

---

(۶) پھر ارشاد ہے :-

"ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے کانگریس کی نمائندہ حیثیت تو سمجھ میں آتی ہے ..... لیکن جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے۔ سوائے ہنگاموں اور جلسوں کے اور آخر کس بنیاد پر وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کی نمائندگی کا امتحان اسوقت ہوگا جب لیگ اپنے لاہور والے ریزولیشن کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرے اور اس ایک مسئلہ پر از سرِ نو انتخاب لڑا جائے" (صفحہ ۱۲)

مسلم لیگ کس بنا پر مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتی ہے !

اس کا جواب اپنے آقایانِ نعمت جناب گاندھی جی وغیرہ کا ہم سے پوچھئے جو بیس مرتبہ تسلیم کر چکے ہیں کہ لیگ مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت ہے۔ باقی رہا امتحان کا سوال۔ تو اس کے لئے جناب سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب، خان بہادر صاحب کو پہلے ہی چیلنج دے چکے ہیں کہ وہ اسمبلی سے استعفٰے دیکر آئیں اور لاہور والے ریزولیشن کے مسئلہ پر از سرِ نو انتخاب لڑیں۔ اگر ہمت ہے تو خان بہادر صاحب میدان میں آئیں۔ نتیجہ دنیا کے سامنے خود بخود آجائے گا

---

(۷) ایک دلیل بڑی دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں :-

"اس سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ آج جو مسلمان مرکزی حکومت کے ماتحت مرکزی سروسوں میں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ملازم ہیں پاکستان کے قائم ہو جانے کے بعد انہیں غیر ملکی سمجھ کر ان کی خدمات سے

سبکدوش کردیا جائے گا. توکیا پاکستان میں ان کے لئے جگہ نکل سکے گی"! (صفحہ ۳۰)

چہ خوش! مسلم لیگ کی "فرقہ پرستی" کی سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ چند ملازمتوں اور نشستوں کیلئے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ یعنی ملازمتوں کا وہ مسئلہ جسے مسلم لیگ اٹھائے تو اسقدر ذلیل سمجھا جاتا ہے. وہ مسئلہ لیگ کی اسکیم کی مخالفت میں استعمال کیا جائے تو اتنی اہمیت اختیار کرلیتا ہے!

مرکزی حکومت (یعنی ہندو اکثریت) کے ماتحت مسلمان ملازموں کا کیا حشر ہورہا ہے. اس کیلئے زیادہ نہیں تو اسمبلی کے کسی ایک سیشن کی روئداد اٹھاکر دیکھئے۔ ہندوؤں کی کشادہ ظرفی آئینہ کی طرح سامنے آجائے گی۔

یہ ہیں وہ دلائل جن کی بناپر لیگ کی اسکیم کو مہمل. نقصان رساں. جاہ پرستی کا اندھا جذبہ۔ مہمل! دور از کار قرار دیا گیا ہے۔ "خیر گذری جو تو خدا نہ ہوا"

دعا کیجئے کہ ان کی یہ مساعی مشکور قرار پائیں اور بارگاہ وارد ہا سے ان کی پچھلی تقصیریں معاف ہوکر انہیں "نجات" کا پروانہ مل جائے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمیں باد

مقتدی حضرات | یہ تو تھے خطبۂ صدارت کے جواہر ریزے۔ اب مختلف مقررین اور مویدین حضرات کے ارشادات گرامی میں سے بھی کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے. ارشاد ہے:-

(۱) یہ اسکیم آزادی ہند کے راستہ میں روڑا اٹکاتی ہے. (خان بہادر اللہ بخش)

(۲) ہندوستان میں برطانوی تسلط کو قائم رکھنے کا حیلہ ہے. (عبدالرحمٰن سرحدی)

(۳) یہ اسکیم برطانوی حکومت کو قائم رکھے گی اور برطانیہ عظمٰی کے مفاد کے لئے ہندوستان اور بیرونی ممالک کے درمیان ایک Buffer State کا کام دے گی (مولانا حفظ الرحمٰن صاحب)

(۴) یہ اسکیم ان حضرات کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جن کے پیش نظر تمام ملک کا مفاد ہے. (مسٹر غلام حسین ہدایت اللہ)

(۵) ملک کے مفاد کے لئے بالعموم، مسلمانوں کے مفاد کیلئے بالخصوص نقصان رساں ہے۔ (مولانا حبیب الرحمٰن)

(۶) ایک شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ (مسر غلام حسین ہدایت اللہ)

(۷) اس اسکیم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتے۔

(حافظ محمد ابراہیم)

(۸) یہ عوام کے مفاد کا تحفظ نہیں کرے گی۔ بلکہ خواص اس سے متمتع ہوں گے۔ (مسٹر محمد امین کھوتو)

(۹) کہا یہ جاتا ہے کہ کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر جو مفروضہ مظالم ہوئے ہیں پاکستانی اسکیم انکا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ مظالم تو پاکستان کے بعد بھی ویسے ہی ہوتے رہیں گے۔..... یہ جو کہا جاتا ہے کہ کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں تو اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں۔ اگر ان صوبوں میں لیگ والے بھی صاحب اختیار ہوتے تو وہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے جو کانگریس نے کیا ہے (حافظ محمد ابراہیم سابق وزیر یوپی)

(ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں۔ طلوع اسلام)

(۱۰) مالیات اور دفاع کے نقاط نگاہ سے یہ اسکیم ناقابل عمل ہے (خان بہادر اللہ بخش)

(۱۱) اس اسکیم میں اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے (مولانا حبیب الرحمٰن)

(۱۲) اس اسکیم کے بعد اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمان اپنے حقوق سے محروم رہ جائیں گے (عبداللہ القاضی بنگال)

(۱۳) اگر سرحد۔ بلوچستان اور سندھ کے مسلمان اس اسکیم سے الگ ہو جائیں تو پنجاب کا پاکستان ایک دیسی ریاست کے برابر رہ جائے گا (خان بہادر اللہ بخش)

(معلوم نہیں کہ پنجاب کو بھی اس اسکیم سے الگ کیوں نہیں کر دیا گیا۔ طلوع اسلام)

(۱۴) یہ با اختیار صوبوں کو دیسی ریاستوں کے درجہ تک پہونچا دیگی (مولانا حبیب الرحمٰن)

(۱۵) مسلمانوں پر یہ مذہبی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہونچا دیں۔ لہذا وہ اپنے آپ کو منطقوں کے اندر مقید نہیں کر سکتے (مفتی کفایت اللہ)

(۱۶) کیا مسلمان اپنی مساجد وغیرہ کو غیر مسلم علاقوں میں چھوڑ دیں گے؟ (مسٹر یسین نوری)

(۱۷) ہم اسلام کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کریں گے۔ اسلام کی حفاظت پاکستان سے نہیں

ہو سکتی۔ مجلس احرار مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے پہلے ہی جد وجہد کر رہی ہے۔ اگر کبھی "اسلامستان" کا الگ وجود عمل میں آیا تو وہ مجلس احرار کے ہاتھوں عمل میں آئے گا۔ (مولانا حبیب الرحمٰن)

(یعنی مجوزہ "اسلامستان" اس لئے ناقابل قبول ہے کہ یہ لیگ کے ہاتھوں عمل میں آرہا ہے

جو اسلامستان مجلس احرار کے ہاتھوں وجود پذیر ہوگا۔ وہ قابل قبول ہوگا!)

(۸) اگر ہندوستان کی تقسیم مذاہب کی بنیاد پر کی جاتی ہے تو ان لوگوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ سکھوں کو ایک "سکھ استھان" بنانے سے روک دیں (مفتی محمد نعیم)

(۹) مسلمان ایک جداگانہ قوم نہیں ہیں کیونکہ

(الف) اس اسکیم کے مجوزین یقیناً ہندوستانی تھے۔

(ب) ہندوستان کے مسلمان۔ بیرون ہند میں ہندی۔ ہندوستانی یا انڈین کہلاتے ہیں۔

(ج) ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اس ملک کے قدیمی باشندوں کی نسل سے ہے۔ اور اس اعتبار سے ڈراوڈین اور آرین سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔

(د) تبدیلی مذہب سے تو قومیت نہیں بدل سکتی۔ (خان بہادر اللہ بخش)

(ان اقتباسات کے حوالے کے لئے دیکھئے اسٹیسمین ۲۷ تا ۲۸ مئی ۱۹۴۰ء)

یہ اعتراضات کسی تبصرے کے محتاج نہیں ان میں سے کم و بیش ہر ایک کے متعلق اس سے پیشتر اصلاً یا ضمناً کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان اعتراضات کو ہم نے بالتفصیل اس لئے درج کر دیا ہے کہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ یہ کس قسم کی ذہنیت رکھنے والے حضرات تھے۔ جو اس کانفرنس میں جمع ہوئے۔ اور انہوں نے وہاں سوائے اس کے کہ ہندوؤں کے اعتراضات کو دہرا دیا۔ اور کیا کیا! چار دن تک یہ حضرات ایک قوم۔ ایک قوم کی رٹ لگاتے رہے اور کسی نے نہیں سوچا کہ ایک قوم بننے کے لئے اولین شرط دلی دوستی ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن کریم کی یہ آیت مقدسہ ان حضرات کے پنڈال کے سامنے سب سے بڑے دروازہ پر جلی حروف میں لکھی ہوئی موجود تھی کہ

والذین کفروا اولیاؤھم الطاغوت ۲/۲۵۷ کفار کے دوست شیاطین ہوتے ہیں۔

چنانچہ چار روز کے بعد یہ کانفرنس ختم ہوئی۔ اور اس کے فیصلوں پر ہندو مہا سبھا کے صدر جناب ساورکر کی طرف سے تبریک و تہنیت کا تار موصول ہوا (ہندوستان ٹائمز ۵ جنوری ۳۷ء) ان کی محنت بر آئی۔ ان کی مساعی مشکور ہوئیں۔ جن کی رضا جوئی کے لئے اس قدر تگ و دو کی گئی تھی۔ انہوں نے اظہار خوشنودی میں مبارکباد کا تار بھیج دیا۔ اور یہ حضرات اس سارٹیفکیٹ کو گلے لٹکائے شاداں و فرحاں یہ کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

کانفرنس کی ناکامی ہندوؤں نے یہ سمجھا تھا کہ ادھر یہ کانفرنس ہوئی اور ادھر ایک طرف قصر ابیض (وائٹ ہال) میں زلزلہ آ گیا۔ اور دوسری طرف مسلم لیگ کی گردن فرط ندامت سے جھک گئی کہ ہمارے دعوئے نمائندگی کا کس طرح پول کھل گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ نہ لندن ہی میں کوئی پتہ کھٹکا اور نہ ہی مسلمانان ہند کو ہی احساس ہوا کہ دہلی میں ہوا کیا ہے۔ نہ برطانوی حلقۂ سیاست میں اس کا کوئی ذکر تک آیا۔ نہ ہی مسلم لیگ نے اس کو درخور اعتنا سمجھا۔ اسی مایوسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ہندو پریس جو اس کانفرنس کے دعوئے ہمہ گیری کا ڈھول پیٹ رہا تھا اب اس طرح خاموش ہے کہ گویا

وہاں بر چہرہ زبچہ بود و بہ شد

حتیٰ کہ گاندھی جی نے بھی ایک لفظ تک اس کے متعلق نہیں لکھا۔ اس تجربہ کی ناکامی سے جو دھکا ہندوؤں کے قلب پر لگا تھا۔ اس کے صدمہ میں کچھ افاقہ ہوا تو حقیقت زبان پر آ ہی گئی۔

مسٹر ایم۔ این راے لکھتے ہیں:۔

"ہم "ہندوستانی قومیت" کی تقسیم کی اسکیم کے خلاف مسلمانوں کے افکار کی شیرازہ بندی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن ہم کانگریسی لیڈروں کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسی کانفرنسوں یا مظاہروں کی قوت یا وزن کے اندازہ کرنے میں حد سے نہ بڑھا کریں۔ جتنی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں ان سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ آزاد مسلم کانفرنس کامیاب ضرور رہی لیکن یہ ایک ہلاکت انگیز تحریک ہوگی۔ اگر یہ

کوشش کی گئی کہ اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ اور اسے خواہ مخواہ مسلم لیگ کی مدِمقابل جماعت سمجھ لیا جائے۔ مسلم لیگ کی قوت اور اس کے ہم خیال طبقہ کی تعداد کو گھٹانے کی کوشش سے کچھ فائدہ نہیں۔ مسلم لیگ آج اس ملک میں مسلمانوں کی بہت بڑی نمائندہ جماعت ہے۔ پاکستان ریزولیشن یا آزاد کانفرنس اس حقیقت کو کبھی بدل نہیں سکتے"۔

(انڈی پنڈنٹ انڈیا۔ ۲؍ مئی ۱۹۴۰ء)

آزاد کانفرنس کے منتظم حضرات اپنی مساعی مشؤمہ کے ان نتائج کو دیکھ کر یقیناً غم و غصہ سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہوں گے۔ کہ خسر الدنیا والآخرۃ ذالک ھو الخسران المبین۔ اسے کہتے ہیں۔

تو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

لیکن انہیں افسوس کس بات کا۔ روپیہ کسی کا صرف ہوا۔ ان کی چار دن ہوٹلوں میں تفریح ہوگئی۔ باقی رہی حمیتِ ملی۔ سو اگر وہ پاس ہوتی تو یہ کانفرنس منعقد ہی کیوں ہوتی۔

تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

باب ششم

کچھ اپنوں سے

اگر یک قطرہ خوں داری - اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

جب انتہائی شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ آسمان شعلہ باری کرتا ہے۔ زمین سے لو کے بھبکے نکلتے ہیں۔ تو کہیں سے ایک سہانی بدلی نمودار ہوتی ہے۔ جو پژمردہ انسانوں کو پھر سے نوید حیات دیتی ہے۔ مردہ دوبارہ جاگ اُٹھتے ہیں۔ نگاہوں میں شعاعِ امید سے تابندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا پھر سے جی اُٹھتی ہے۔ جب بادِ خزاں ہر باغ و راغ کو اجڑے ہوئے بہشت کا نقشہ بنا دیتی ہے۔ تر و تازگی کا کہیں نشان باقی نہیں رہتا۔ نزہت و لطافت گم ہو جاتی ہے۔ تو اس کے بعد بہار کا دور آتا ہے۔ شگوفے پھوٹتے ہیں۔ کلیاں مہکتی ہیں۔ غنچے چٹختے ہیں۔ زندگی ہر شاخ سے تڑپ تڑپ کر باہر آ جاتی ہے۔ بشاشت و شگفتگی اُبل اُبل کر پھوٹتی ہے۔ ہر طرف ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ ہر سمت ایک جہانِ نو کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔

جب رات کی تاریکی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ روشنی کا منفذ بند ہو جاتا ہے۔ نور کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ تو اس کے بعد خاورِ مشرق اپنی پوری شانِ جہاں تابی سے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ اندھیرا گم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف نور کی چادر بچھ جاتی ہے۔ ذرہ ذرہ کروٹ بدلتا ہے۔ حیاتِ تازہ انگڑائیاں لیتی ہے۔

نظامِ کہن کی بساط الٹ جاتی ہے اور ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔

یہ فطرت کے اٹل قوانین ہیں۔ یہ نظامِ کائنات کے غیر متبدل ضوابط ہیں۔ ان سے کسی کو مفر نہیں کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

لیکن جب یہ قوانینِ فطرت۔ کائنات کی ہر شے کو محیط ہیں۔ تو کیا انسان۔ جو چاروں طرف سے ضوابط فطرت کے حدود سے گھرا ہوا ہے۔ ان سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں! یہ بھی ان سے مستثنیٰ نہیں۔ قوموں کی زندگیاں بھی انہی قوانین وضوابط کے تابع ہوتی ہیں۔ جب کوئی قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔ وہ نکبت وادبار کے گرداب میں پھنس جاتی ہے تو اس پر افسردگی اور پژمردگی چھا جاتی ہے۔ مایوسیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور امید کی کوئی جھلک کہیں سے نظر نہیں پڑتی۔ لیکن اس انحطاط وتنزل کے بعد ان کے اندر پھر سے زندگی کی تڑپ نمودار ہوتی ہے۔ اور وہ ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور لٹی ہوئی دولت کی وارث بن جاتی ہے۔ لیکن جس طرح قطراتِ بارش سے دوبارہ زندگی اسی زمین کو مل سکتی ہے جس میں ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت باقی ہو۔ بادِ بہاری سے وہی شاخ گل پیرہن ہو سکتی ہے۔ جو اپنی اصل سے کٹ کر الگ نہ ہو چکی ہو۔ نورِ سحر سے وہی آنکھ فیض یاب ہو سکتی ہے جس کی بینائی باقی ہو۔ اس طرح دوبارہ زندگی بھی وہی قومیں حاصل کر سکتی ہیں جن میں زندہ رہنے کی تمنا ہو اور ان کا رشتہ اپنے اصل سے منقطع نہ ہو چکا ہو۔ ہندوستان کے مسلمان ایک مدت سے افسردگی وپژمردگی خستگی وبدحالی۔ نکبت وافلاس کے جہانِ نامساعد میں سسکیاں لے رہے تھے۔ نہ ان کے سینوں میں دل باقی تھے۔ نہ دل میں کوئی ولولہ۔ نہ رگوں میں خون باقی تھا نہ خون میں حرارت نہ زندگی کا کوئی نصب العین سامنے تھا نہ اس نصب العین کے حصول کی تڑپ زندگی ان کے نزدیک محض نفس شماری کا نام تھا اور دنیا سزا بھگتنے کا جیل خانہ۔ اس دوران میں کئی ایک چارہ ساز اٹھے۔ اور مقدور بھر ان کے درد کا درمان سوچا۔ ان کی نیتیں نیک اور کوششیں مخلص تھیں۔ لیکن چونکہ مرض کہنہ اور پیچیدہ تھا۔ اس لئے کوئی صحیح علاج نہ ہو سکا۔ جب یہ درد بڑھ کر اس انتہائی نقطہ تک جا پہنچا۔ جہاں سے قاعدہ فطرت کے ماتحت ردِ عمل شروع ہوتا ہے۔ تو قدرت نے اپنی گرم گستری سے ان کے اندر ایک ایسا مردِ مومن پیدا کر دہ

جس نے ان کے مرض کی صحیح صحیح تشخیص بھی کی اور اس کا علاج بھی سوچا۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات   تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اس نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے بہت جلد محسوس کر لیا کہ مسلمان کی تمام مصائب و نوائب کا راز اس میں ہے کہ یہ اپنے مقام کو بھول چکا ہے۔ اپنے آپ کو فراموش کر چکا ہے۔ چنانچہ اس مسیحائے اُمت نے اپنی تمام عمر اس جہاد میں صرف کر دی کہ وہ مسلمان کو اسکے صحیح مقام سے روشناس کر دے۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے۔ ہر جگہ اسی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ مسلمان کا صحیح مقام کیا ہے! وہ اس سے کہتے ہیں کہ۔

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے   تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور وہ اسے بتاتے ہیں کہ

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ   اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

جب انسان اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر اس میں زندگی کی ایک نئی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اب اس مقام پر اسے اپنے صحیح نصب العین کی تلاش ہوتی ہے۔ اور وہ اسی تلاش میں تشنہ لب۔ مستانہ وار۔ اِدھر اُدھر دوڑتا ہے یہی زندگی کی علامت ہے۔ بلکہ عین زندگی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است   کاروانش را درا از مدعا است

زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو است   فطرت ہر شے امین آرزو است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار   تا نگردد مشتِ خاک تو غبار

انہوں نے مسلسل تدبر و تفکر کے بعد مسلمان کے لئے ایک مکمل نصاب مرتب کر دیا جس کے اتباع سے وہ موجودہ پستی سے ابھر کر اپنے صحیح مقام کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہم نے اس نصاب کی طرف پوری پوری توجہ نہیں دی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ابھی تک یوں ذلیل ہو رہے ہیں۔ یہ نصاب قرآن کریم کی ہی تفسیر و تشریح ہے۔ اور جب تک ہم قرآن کی طرف نہیں لوٹتے ہماری کوئی

کوشش بار آور نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے جب یوں زمین تیار کرلی تو اس کے بعد وہ مقام آیا جہاں پہنچ کر انھوں نے قوم کے لئے نصب العین مقرر کرنا تھا۔ جہاں ان کے مدعا کا تعین کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سنہ ۱۹۳۰ میں اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت ثابتہ کو قوم کے سامنے رکھ دیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسلمانوں کو حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد رکھنی چاہیے۔ اور اپنے تمام ذرائع واسباب کو اس مقام پر مرکوز کر کے اپنے اندر وہ قوت پیدا کرلینی چاہیے جس سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوسکے۔ یہ تھا وہ درخشندہ نصب العین جو انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ بلکہ اسی اصول کی عملی تشریح تھی جس کی طرف وہ اس وقت سے بہت پہلے اشارہ کرچکے تھے۔ جب فرمایا تھا کہ

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار　　با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں　　می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را　　می دہد ترکیب نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند　　چرخ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار　　روزگار نو کہ باشد سازگار

(اسرار و رموز)

یہی "جہان نو" تھا جس کی تشریح انہوں نے سنہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر کی تھی۔ "شاعر فردا" کی یہ آواز شاید قبل از وقت سمجھی گئی۔ اس لئے اس پر وہ توجہ نہ دی گئی جس کی وہ مستحق تھی۔ قوم دس برس تک مصروفِ دشت نوردی و بادہ پیمائی رہی۔ اور اس کے بعد مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں۔ اسی مرد قلندر کی لحد کے سرہانے کھڑے ہو کر لفظاً لفظاً وہی کہا جو اس نے دس سال پیشتر الہ آباد میں کہا تھا۔ یہ ہے لیگ کا ریزولیشن جو ہمارا محل موضوع ہے۔ نصب العین متعین ہونے کے بعد اس کے حصول کی جد و جہد ایسی ہی ہے جیسی ٹکٹ خرید لینے کے بعد گاڑی میں سوار ہونے کی تگ و دو۔ ورنہ اگر آپ ٹکٹ خرید کر آرام سے وہیں بیٹھے رہیں۔ تو منزلِ مقصود تک قیامت تک بھی نہیں پہنچ سکتے" اس تگ و دو میں سب

سے پہلا اور سب سے اہم بنیادی مرحلہ ہے اس نصب العین پر یقین۔ ایسا محکم یقین جو ایمان کا درجہ لئے ہوئے ہو۔ ایسا غیر متزلزل ایمان جس کی کیفیت عشق تک جا پہنچی ہو۔ اگر آپ میں یہ یقین موجود ہے۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس نصب العین کے حصول سے روک نہیں سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

یاد رکھئے۔ قوموں کی موت وحیات کا فیصلہ ان کے **یقین** کے استحکام کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ یقین۔ اور ایک صحیح نصب العین کی صداقت کا یقین۔ ایمان اور قرآنِ کریم کی روشنی میں متعین کردہ مدعا کا ایمان۔ آپ سمجھ نہیں سکتے کہ اس سے قوموں میں کس قدر بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کس درجہ کوہ شکن ہمت اور فلک پیما عزم پیدا ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ

یہ **ثُمَّ اسْتَقَامُوا** کیا ہے وہی جسے ایمان محکم کہا گیا ہو وہی جو حصول نصب العین کا ناقابل شکست ارادہ ہے۔ وہی جسے انگریزی میں ریزولیشن (Resolution) کہتے ہیں اگر آپ اس کے صحیح معنی سمجھ لیں تو پھر فی الواقعہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس کے حصول سے روک نہیں سکتی۔ اور تو اور خود گاندھی جی۔ جو اسکیم کے اس قدر شدید مخالف ہیں۔ وہ بھی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ

"اگر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان فی الواقعہ اس اسکیم کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس خطۂ ارض پر کوئی ایسی قوت نہیں جو انھیں اس سے باز رکھ سکے۔ خواہ اس کی کتنی ہی تشدد آمیز یا عدم تشدد کے انداز کی مخالفت کیوں نہ ہو۔

(ہندوستان ٹائمز 5/5/40)

سوال صرف اتنا ہے کہ "آپ ایسا چاہتے ہیں یا نہیں"؟ اگر آپ "چاہتے ہیں" تو پھر یہ ہو کر رہیگا اور

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہوں

یاد رکھئے! اگر یہ اسکیم (خدانکردہ) ناکام رہی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ ہندوؤں نے اس کی اس درجہ مخالفت کی تھی۔ انگریز اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ خود مسلمانوں میں سے ایک جماعت ہندو کی

ہم نوائی میں اس کے خلاف یورش کرکے اُمنڈ آئی تھی۔ اس ہجوم مخالفت سے یہ کبھی ناکام نہیں رہ سکے گی۔ وہ کون سا وقت تھا کہ حق کی مخالفت نہیں ہوئی! وہ کونسا زمانہ تھا کہ باطل اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کرکے حق کے خلاف یلغار کرکے نہیں آتا رہا؟ یہ خیر و شر کی جنگ شروع سے چلی آرہی ہے۔ اس لئے یہ کشمکش اس اسکیم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اگر یہ ناکام ہوئی تو اس لئے ہوگی کہ اپنے نصب العین کی صداقت پر آپ کا یقین۔ یقینِ محکم نہ تھا۔ آپ کا عہد۔ عہدِ استوار نہ تھا؛ آپ کا عشق۔ عشقِ صادق نہ تھا۔ ورنہ یہ مخالف اور مخالفوں کی قوتیں، ایمان کے سامنے ان کی حقیقت کیا ہے! ایمان والوں کی تو حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ۝

جب ان سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے مخالفین تو ایک ہجوم پیدا کر رہے ہیں۔ اس لئے اُن سے ڈرو تو اس اطلاع سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا۔ اور انہوں نے کہا کہ (یہ ہجوم اکٹھے ہوتے ہیں تو ہونے دو) ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔ اور وہ بہترین کارساز ہے۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ۝

پس وہ اللہ کے فضل و نعماء سے (جھولیاں بھر بھر کر) واپس لوٹے۔ اور انہیں کسی قسم کی کوئی گزند نہ پہنچ سکی (اس لئے کہ) انہوں نے اللہ کی رضاجوئی اختیار کی تھی۔ اور اللہ بہت بڑے عظیم الشان فضل (وکرم) کا مالک ہے۔

مومن کو مخالفین کی یورش و یلغار سے کیا خوف۔ فرمایا کہ

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے تمہیں ڈراتا ہے سو ان سے مت ڈرو۔ صرف مجھ ہی سے ڈرو اگر تم صاحب ایمان ہو تو۔

اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ شیطان کے دوست کون ہیں جن سے شیطان ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح میں فرمایا کہ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـئُھُمُ الطَّاغُوْتُ (۲:۲۵۷) کفار کے دوست شیاطین ہیں یعنی یہ کفار اور اُن کی دوستی کا دم بھرنے والے سب ایک ابلیسانہ سازش کے ماتحت شور مچاتے رہتے ہیں کہ کسی طرح اس سے مسلمانوں کو مرعوب کر دیں اور ان کے دل پر خوف طاری ہو جائے لیکن قرآن کریم نے مومن کی نشانی یہ بتائی ہے کہ ایسے وقت میں اس کا ایمان اور بڑھ جائے اور اس کا عزم اور راسخ ہو جائے۔ اپنے نصب العین کی صداقت واضح ہو کر اس کے سامنے آجائے۔ اپنے خدا پر بھروسہ اور قوی ہو جائے۔ مخالفت کے اس تمام ساز و سامان کو دیکھے اور انہیں استہزاء کی ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ دیکھتا ہوا مستانہ وار آگے بڑھ جائے۔ اس کا بھروسہ اس ساز و سامان اور اسباب و ذرائع پر تو ہوتا ہی نہیں۔ یہ تو اس کے نزدیک ثانوی چیزیں ہیں۔ اس کا بھروسہ تو اپنے خدا پر ہوتا ہے۔ اور خدا پر بھروسہ ہی وہ قوت ہے کہ جو اس کے ہاتھوں کی "کھجور کی ٹہنیوں" میں شمشیر جگر دار کے جوہر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک مومن اور کافر میں یہی تو فرق ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یوں تو دنیا میں ہر زمانہ میں تغیرات ہوتے چلے آئے ہیں لیکن جس برق رفتاری کے ساتھ دورِ حاضرہ میں تغیرات رونما ہو رہے ہیں، اس سے پیشتر اس کی نظیر بمشکل مل سکے گی۔ آج تو صبح اور شام میں قوموں کی تاریخ بدل جاتی ہے۔ زمین کا جغرافیہ بدل جاتا ہے۔ اس عظیم الشان انقلاب کے زمانہ میں ہر وہ قوم جو اپنے مستقبل سے ذرا بھی غافل ہوئی۔ پیس کر رکھدی جائیگی۔ جو ذرا بھی کمزور ہوئی۔ کچل دی جائیگی۔ یہ اصولِ فطرت ہے۔ یہ قاعدۂ روزگار ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت سے نوازا ہے۔ وہ صاف صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کس قسم کے انقلابات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر مسلمان اس کشمکش میں اپنی زندگی چاہتا ہے تو اسے "فولاد بن کر جینا ہوگا۔ اور اس کی عملی شکل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمام مسلمان ایک مرکز کے ساتھ وابستہ ہوکر رہیں۔ اور وہ اپنے اندر ہم آہنگی اور یک نگہی کے جوہر پیدا کریں۔ اپنے عسکری نظام کو پھر سے زندہ کریں۔ اور یوں ایک "بنیان مرصوص" بنکر دنیا کی ہر مخالفت کا مقابلہ کریں۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ اسلامی حکومت کے قیام کا جو نصب العین ان کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اس کی صداقت پر کٹ مرنے کا عزم پیدا کریں۔ اور یوں بساطِ سیاست کے اس نظامِ کہن کو اُلٹ کر ایک جدید نظام کی طرح ڈالیں۔ کیا آپ نے نہیں سُنا کہ جب سیمرغ اپنے والہانہ جذبات میں مست ہوجاتا ہے تو خس و خاشاک کو اپنے گرد جمع کرکے۔ این و آن سے بے خبر آنکھیں بند کرکے اس ڈھیر کے اندر بیٹھ جاتا ہے۔ عشق کے دیپک کی شعلہ ریز موسیقی اس کے رگ و پے سے نکل کر اس کے گرد وپیش کی کائنات کو پھونک دیتی ہے۔ اور یہ سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ لیکن اس راکھ کے ڈھیر سے پھر ایک نیا سیمرغ پیدا ہوتا ہے جس کی رگوں میں خونِ شباب اور جس کے بازوؤں میں قوتِ شاہین موجزن ہوتی ہے۔ یہی حالت قوموں کی موت و زیست کی بھی ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

یہ جہانِ نو تعمیر ہو کر رہے گا۔ یہ دنیائے جدید بن کر رہے گی۔ یہ زمانے کے مقدرات ہیں۔ یہ فطرت کے اٹل قاعدے ہیں۔ اگر۔ بقول حضرت علامہ رح مسلمانوں نے اس کی قیمت جلد پیش کردی تو یہ جلدی وجود میں آجائے گا۔ اور اگر کوتاہی کی تو اس میں دیر لگ جائے گی لیکن صرف دیر ہی ہو گی۔ عمل میں یہ آکر رہے گی۔ کہ اللہ نے مسلمانوں سے اقوامِ زمین ایشیا کی پاسبانی کا کام لینا ہے۔ ان سے

دنیا کی امامت کا فریضہ سرانجام دلانا ہے۔ اس لئے اُس کی حکمت و رحمت سے بعید نظر آتا ہے کہ وہ نو کروڑ کی اس جمعیت کو یوں ورطۂ کفر میں ڈوب جانے دے۔ لیکن سوال یہ نہیں کہ مشیت خداوندی کیا ہے سوال تو یہ ہے کہ اس مشیت کی تکمیل کے لئے تم کیا کرتے ہو۔ ظہور و تمکین اسلام خدا کا لکھا ہوا نوشتہ تھا جسے پورا ہو کر رہنا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل بدر و حنین کے اُن زندہ جاوید قدوسیوں کے ہاتھوں ہوئی جن کا مقدس خون شجر اسلام کی ہر شاخ کی نمی کا باعث ہے۔ آج اسلام کا شجر طیب پھر اُسی نمی کا محتاج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت ازلی کس کے حصے میں آتی ہے۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
اب کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

مبارک ہیں وہ جو اپنے خدائے قدوس کی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے سر بکف و کفن بدوش میدان میں آجائیں کہ اسلام پنڈالوں کے اندر زندہ نہیں ہوتا میدانوں میں زندہ ہوتا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل! نہ "جل ترنگ"

والسلام

(بقیہ ص…)

شعبوں کے متعلق خاکساروں کے نزدیک امیر کا حکم ہی قولِ فیصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آج تک مسٹر جناح جیسے ہمدرد کو بھی وہ اختیارات تفویض نہیں کئے اور اسی لئے مسٹر جناح یا کوئی اور ان کے اس معاملہ میں دخل نہیں دے سکتا۔ یہ چیز خاکساروں کے نزدیک مذہبی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ آپ انہیں اس بات پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ان باتوں کو جو مذہب کیوں بنائے ہوئے ہیں یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ موجودہ حکومت اس میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ حکومت کا کام یہ ہے کہ ان کے مذہبی جذبات کا احترام رکھتے ہوئے ان کے امیر سے معاملہ طے کرے اور جس چیز کو وہ مداخلتِ فی الدین کہتے ہیں اس سے پابندیاں اٹھالے۔ معاملہ حل ہو جائیگا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے کیا حشر برپا ہو جائے گا۔ سکھوں کو۔ ان صوبوں میں بھی جہاں تلوار پر لائسنس ہے تین تین فٹ لمبی تلواریں لٹکا لیں، رکھنے کی اجازت مل سکتی ہے لیکن خاکساروں کو بیلچہ اٹھانے کی بھی اجازت نہیں مل سکتی؟ کانگریس کی طرف سے پنجاب میں ستیہ گرہ کیمپ قائم کئے جا رہے ہیں۔ جو ان رضاکاروں کے مرکز ہوں گے جو عند الضرورت گورنمنٹ کے سول نافرمانی کریں گے۔ ان کے خلاف حکومت کا کوئی قدم نہیں اٹھا لیکن

[illegible]

اسلامی معاشرت

نقش ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی عادات واخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ۔ اس کے تمدن ومعاشرت کے خط وخال۔ اس تعلیم وتہذیب۔ اس کے دنیائی معاملات۔ اپنوں اور بے گانوں سے اس کے تعلقات۔ غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز واسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اِس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہے بچوں کے لیے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب ودماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۴ر۔ محصول ار

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ دہلی

بنر ردایس نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) **طلوعِ اسلام** ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع - زیادہ سے زیادہ - دس تاریخ تک دیجئے - ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو - اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ر تاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع (جوابی) کارڈ رکھ دیا جاتا ہے - جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہیے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے - اور قیمت فی پرچہ (۸ر) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ وہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی - پی - طلب کرنے کے بعد اُسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھئے - نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمایئے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں - اس لیے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے - ورنہ ہمیں بے حد وقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا - کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "**طلوعِ اسلام**" کوئی تجارتی ادارہ نہیں - بلکہ ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لیے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں - واللّٰہ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچے کیلئے ۴٫ر کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

ناظم
ادارہ طلوع اسلام
دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office Delhi.